اُردو کا دبستانِ خلیج

پروفیسر حسین سحر

اُردو کا دبستانِ خلیج

پروفیسر حسین سحرؔ

سحر سنز۔ ملتان

ضابطہ

اشاعت اول:	2011ء
اہتمام:	الکتاب گرافکس ملتان
طباعت:	عاتکہ پرنٹرز
قیمت:	-/300روپے

ملنے کا پتا

کتاب نگر حسن آرکیڈ۔ ملتان

انتساب

دبستانِ خلیج کے تمام اہلِ قلم
کے نام!

ترتیب

پیش لفظ: 7

باب اوّل: 9

ا۔ دبستانِ کیا ہے؟

ب۔ دبستانِ خلیج کی تشکیل:

(فکری وفنی اقدارِ مشترک: ترکِ وطن کا احساس، وطن سے دوری اور مجبوری
کا تجربہ، حبِ وطن کا جذبہ، خطۂ عرب سے جذباتی لگاؤ، اہلِ قلم کے باہمی
میل جول سے فکر ونظر میں وسعت، ادب کی مرکزی رو سے دوری، حسرتِ
تعمیر، دشت وصحرا سفر، منزل، شجر پرندہ اور سورج کا استعارہ)

باب دوم: 20

دبستانِ خلیج کی مختصر تاریخ:

باب سوم: 21

دبستانِ خلیج کا فروغ:

(اخبارات ورسائل، مرتبہ کتب، ادبی انجمنیں اور ادارے،
مشاعرے، نظامت، صحافت، تقریبات میں مشاہیر کی آمد۔)

باب چہارم: 26

دبستانِ خلیج کا ارتقاء:

صنف وار مختصر تذکرہ۔غزل۔نظم۔دینی ادب۔افسانوی ادب۔طنز و مزاح۔

انشائیہ۔ خاکہ نگاری۔کالم نگاری۔بچوں کا ادب۔تنقید و تحقیق۔تبصرہ

و تاریخ۔ترجمہ

باب پنجم: 30

مختصر تذکرہ اہل قلم:

عرب النسل اہلِ قلم۔خواتین۔رفتگاں۔لوٹنے والے۔

صاحبِ کتاب اہلِ قلم۔نمایاں اہلِ قلم۔ملک وار تقسیم۔

باب ششم: 41

نمائندہ اہل قلم کا خصوصی مطالعہ:

☆.....اقبال فرید (اقبال فرید ایک فنکار شاعر) 42

☆.....جاوید اختر جاوید (حُسن آوارگی کا شاعر) 51

☆.....ریحان اظہر.....(ایک کامیاب ناول نگار) 59

☆.....سعید قیس (سعید قیس کی شاعری) 62

☆.....سہیل ثاقب (آشنائے روورِ منزل) 69

☆.....شفیق ندوی (شفیق ندوی کی شاعری) 76

☆.....شوکت جمال (شوکت جمال کی شوخ بیانی) 93

☆.....صفدر حسین (.....بچوں کے مقبول ادیب) 98

☆.....طارق محمود طارق .....(تیسرا موسم) 103

☆.....عابد معز کی شگفتہ بیانی 110

☆.....ع۔س۔مسلم (مسلم بحیثیت شاعر) 114

☆.....محمود عالم (محمود عالم کی افسانہ نگاری) 137

☆.....مسرت جبیں زیبا (محبت کے رچاؤ میں ڈوبی ہوئی آواز) 143

☆.....نسیم سحر (جاگتے خوابوں کا شاعر) 147

☆.....یوسف مرزا رہبر (متاعِ دردِ دل کا حامل 159

☆.....یونس قاضی (آگہی کی تلاش کا شاعر) 166

☆☆☆☆☆

پیش لفظ

آج سے چودہ پندرہ سال پہلے جب میں ریٹائرمنٹ کے بعد سعودی عرب گیا۔تو وہاں کی علمی وادبی سرگرمیوں میں شرکت کا موقع ملا۔وہاں مقیم برصغیر کے تارکینِ وطن اہل قلم سے ملاقات ہوئی۔تو میں نے محسوس کیا کہ ان شاعروں اور ادیبوں کا اندازِ فکر ہمارے تمام لکھنے والوں سے قدرے مختلف اور منفرد ہے۔اور اس کی بڑی وجہ ان کا ترکِ وطن کا تجربہ ہے۔پھر وہاں کے مخصوص ماحول اور روایات کے زیر اثر بھی ان کے اندازِ تحریر میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔کم وبیش یہی صورتحال خلیج کے دیگر ممالک میں بھی نظر آئی۔

اِن ممالک میں طویل عرصہ قیام کے دوران یہاں تخلیق ہونے والے ادب کا میں نے قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اُردو کی نئی بستیوں میں خلیج کا یہ وسیع وعریض خطہ بجا طور پر ایک دبستان کہلانے کا مستحق ہے۔جس کے اپنے مخصوص خدوخال اور نقش ونگار ہیں۔وہیں مجھے اس موضوع پر لکھنے کا خیال آیا۔چنانچہ میں نے متعلقہ مواد اکٹھا کرنا شروع کردیا۔اور بالآخر اسے موجودہ شکل میں پیش کررہا ہوں۔

یہ کتاب کسی تحقیقی اور تفصیلی مقالے کی شکل میں نہیں۔بلکہ ایک نہایت مختصر تذکرے کی صورت میں ہے۔میں نے کوشش کی ہے کہ مختلف اصنافِ ادب کے حوالے سے یہاں ہونے والے کام اور سرگرمیوں کی ایک مختصر سی جھلک پیش کردی جائے۔چنانچہ اس غرض سے صرف اداروں اور لکھنے والوں کی اسم شماری پر اکتفا کیا گیا ہے۔بصورت دیگر تفصیلی جائزے کی شکل میں

اس کی ضخامت کہیں زیادہ بڑھ جاتی۔البتہ چند نمائندہ اہلِ قلم کے فن وشخصیت پر میں نے تفصیلی مضامین ضرور تحریر کئے ہیں۔جو اس کتاب کے آخر میں شامل ہیں۔ان مضامین سے جہاں ان لکھنے والوں کے مزاج اور ان کے اندازِ تحریر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے وہاں دبستانِ خلیج کے مجموعی مزاج کو بھی دریافت کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب کو خلیج کے اہل قلم کا ایک مختصر تذکرہ بلکہ اشاریہ ہی کہا جاسکتا ہے۔جس کو بنیاد بنا کر اس موضوع پر آئندہ ایک بسیط کام ہوسکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کتاب خلیج کے چند نمائندہ اہل قلم کا تعارفی مطالعہ ہے۔اور دبستانِ خلیج کے دیگر اہل قلم اور اداروں کا ذکر صرف اس کا پس منظر واضح کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔

جہاں تک تفصیلی مطالعے کا تعلق ہے۔اسے میں اس موضوع پر آئندہ تحقیق کرنے والوں پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس کتاب سے آگے کا سفر کرتے ہوئے خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر جاری رکھیں۔

میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ مختلف دستیاب ذرائع اور وسائل کی مدد سے دبستان کے جملہ اداروں اور لکھنے والوں کا ذکر اس کتاب میں آجائے لیکن۔ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تاہم اگر کوئی نام رہ گیا ہو تو اپنی اس کوتاہی پر میں معذرت خواہ ہوں گا۔کوشش کی گئی ہے کہ کسی قسم کے تقدم وتاخر کا خیال رکھے بغیر تمام اداروں اور لکھنے والوں کے نام الف۔بائی ترتیب سے دیئے جائیں۔آخر میں اپنے قارئین کی آرا کا مجھے انتظار رہے گا۔

پروفیسر حسین سحر

دبئی (امارات)

00971-558985004

باب اوّل

دبستان کیا ہے؟

دبستان کی تعریف ہم کچھ یوں کریں گے۔

ایک خاص خطے یا علاقے میں ایک ہی اندازِ فکر وفن رکھنے والے اہل قلم کا ایک بڑا حلقہ جن کے درمیان کئی فکری وفنی اقدارِ مشترک ہوں ایک دبستان تشکیل دیتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیا کے تقریباً ہر خطے میں لکھنے والے موجود ہیں۔اوران میں کچھ علاقوں کے اہلِ قلم اپنا ایک مخصوص مکتبہ فکر یا دبستان بھی رکھتے ہیں۔اُردو زبان کے سلسلے میں بھی یہی صورتحال ہے۔اس زبان کے آغاز سے لے کر اب تک اس کے متعدد دبستان وجود میں آچکے ہیں۔مثلاً دبستانِ دکن، دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ لاہور، دبستانِ کراچی اور دبستانِ سرگودھا وغیرہ جو اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔اسی طرح اُردو لکھنے والوں نے جب چالیس سال پہلے برصغیر سے باہر دنیا کے مختلف خطوں میں جب نئی بستیاں بسائیں۔تو اس عرصے میں اہل قلم کی ایک کثیر تعداد نے وہاں مخصوص دبستان تشکیل دئے۔

دبستانِ خلیج کی تشکیل:

انہی دبستانوں میں خلیج کے ممالک میں رہنے والے ادیبوں شاعروں کا بھی غیر محسوس طور پر ایک دبستان وجود میں آیا۔جسے دبستانِ خلیج کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔اس دبستان کے علاقے میں خلیجی ممالک یعنی سعودی عرب، بحرین، قطر، کویت، سلطنت عُمان، (مسقط) اور عرب امارات شامل ہیں۔اوراس دبستان کی تشکیل میں جو خاص فکری وفنی اقدار مشترک ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ترکِ وطن کا احساس

۲۔ وطن سے دوری اور مجبوری کا تجربہ

۳۔ حبِ وطن کا جذبہ

۴۔ خطۂ عرب سے جذباتی وابستگی خاص طور پر سرزمین حجاز (مکہ ومدینہ) سے حمد ونعت کی صورت میں ایمانی تعلق کا اظہار۔

۵۔ دیگر ممالک خاص طور پر برصغیر کے ممالک کے اہل قلم سے باہمی رابطے کے سبب فکر و نظر میں وسعت۔

۶۔ ادب کی مرکزی رو سے دوری کا احساس

۷۔ حسرتِ تعمیر

۸۔ دشت، صحرا، سفر، راہ، منزل، شجر، پرندہ اور سورج کا استعارہ۔

اب ہم ان اقدارِ مشترک کی دلیل شعرائے خلیج کے شعروں کی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔یہ اشعار زیادہ تر ان کی غزلوں سے لئے گئے ہیں کہ زیادہ تر غزل ہی یہاں کے شعرا کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے۔

حُب وطن:

میں دور ہوں تجھ سے تو بہت پاس ہوں تیرے
اے ارضِ وطن تو نے مجھے عشق سکھایا

(قمر حیدر قمرؔ)

اپنے جوان خون سے سینچا ہے یہ چمن
ہو خوشبوؤں کا راج سدا میرے دیس میں

(جاوید اختر جاویدؔ)

کس قدر قیمتی ہے خاکِ وطن
بے دیاروں سے پوچھ کر دیکھو

(ممتاز راشد)

مل جل کر تعمیر کریں ہم آؤ ایسا پاکستان
جس کا ہر اک باشندہ ہو چلتا پھرتا پاکستان

(نسیم سحرؔ)

اس دھرتی کی بنیاد میں ہے خونِ شہیداں
اس دھرتی پہ مہکیں گے گلاب اور طرح کے

(صبا انور)

یادِ وطن:

اپنے دیس میں پھر برسات کا موسم ہے
چپکے سے آنسو کہتا ہے آنکھوں میں

(شمع ظفر)

دیارِ غیر میں اپنوں کے خواب دیکھے ہیں
بنوکِ خارک بھی ہم نے گلاب دیکھے ہیں

(حسین سحر)

یہ آج دیکھ کے آئی ہیں کن مناظر کو
وطن کی سمت سے آتی ہوائیں پرنم ہیں

(شمع ظفر)

سفر میں ہوں نہ زر رکھنا نہ کوئی اور دھن رکھنا
اگر مل جائے میری قبر میں خاکِ وطن رکھنا

(حیدر اعظمی)

دورِ وطن سے اپنے دل کی حالت کیا بتلاؤں میں؟
کچھ دکھ درد کے دریا ہیں اور کچھ غم کی تصویریں ہیں

(عبدالرزاق صدف)

لپٹ کر پاؤں سے بولی مسافت
بالآخر دیس ہی دارالاماں ہے

(خالد عباس اسدی)

لاکھ معطر اور شاداب زمینیں ہوں
اپنی مٹی اور ہی خوشبو دیتی ہے

(ممتاز راشد)

گھر کی یاد:

ذکا بچوں کو پھر لکھا ہے میں نے
بس اب کچھ دن میں ہم گھر آرہے ہیں

(ذکا صدیقی)

ہمارے زخموں پہ مرہم سا رکھ دیا گویا
اس ایک خط نے کہ جو آج گھر سے آیا ہے

(اقبال طالب)

وہ گلی جس میں تم بھی کبھی ساتھ تھے
اب تو خوابوں کی دہلیز پر رہ گئی

(راشد فضلی)

یہ رنگیں محفلیں یہ رقصِ پیہم چاند تاروں کا
یہاں سے لوٹ کر ہم اپنے گھر جاتے تو اچھا تھا

(شبنم مناروی)

سارے مجبوریوں کے سودے ہیں
کوئی یوں دربدر نہیں ہوتا

(طارق محمود)

ہر دل میں تواضع تھی ہر اک رخ پہ سواگت
جب لوٹ کے میں اپنے حسیں شہر میں آیا

(قمر حیدر قمر)

لگ رہا ہے کہ عمر بھر کیلئے
ہم ترستے رہیں گے گھر کیلئے

(رشید نیاز)

برق رفتار تغیر کا سماں ہے کہ نہیں
گھر جہاں چھوڑ کے آئے تھے وہاں ہے کہ نہیں

(عرفان اعظمی)

جانے والا آنکھوں سے نیند لے کے جاتا ہے
اس کے بعد گھر والے عمر بھر نہیں سوتے

(ثروت زیدی)

ذرا گھر کے مسائل سے نمٹ لوں
پھر اس کے بعد باہر دیکھنا ہے

(اقبال قمر)

ترکِ وطن.....ہجرت.....بے گھری:

سحر لے آئے ہیں اور شام پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ہمیں احساس ہے کچھ کام پیچھے چھوڑ آئے ہیں

(مشتاق شاد)

رزق بھی اپنا سزا کے طور پر لکھا گیا
ہم وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے

(شہزاد قمر)

بے گھری جن کا مقدر ہو گھروں کے ہوتے
وہ پرندے کہاں اڑتے ہیں پروں کے ہوتے؟

(اقبال قمر)

اب اس حالت میں ڈر لگنے لگا ہے
ہمیں پردیس گھر لگنے لگا ہے

(یونس اعجاز)

چھوڑ کر چھاؤں ماں کے آنچل کی
جستجوئے معاش پر نکلے

(آفتاب ترابی)

یہ آخری منزل ہے مرے سارے سفر کی
اب مجھ سے کوئی نقل مکانی نہیں ہوتی

(زین صدیقی)

دیارِ غیر کے سورج کو کیا سراہوں میں
کہ میرے گھر کے دیئے ٹمٹمانے والے ہیں

(ممتاز راشد)

کوئی تو خوف ہے آتی ہوئی شب میں ان کو
کیوں پرندوں نے سرِشام یہ ہجرت کی ہے

(یوسف علی)

آس تھی بھول تھی قسمت تھی پتہ کچھ نہ چلا
ہم تو صحرائی ہوئے اپنے گھروں کے ہوتے

(اقبال فرید)

سفر.....مسافت:۔راہِ منزل

عجب وثوق سے منزل کی دھن میں نکلا ہوں
کہ راستے مرے پاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں

(یونس اعجاز)

نجانے کیسی گھڑی میں سفر پہ نکلے تھے
سفر تمام ہوا اور ہم سفر نہ ملا

(منورالنساءمنور)

اوروں کیلئے چلتا رہوں اور کہاں تک؟
مجھ کو مرے حصے کا سفر کیوں نہیں دیتے؟

(اقبال قمر)

نہ راستے ہی میں ٹھہریں نہ اپنے گھر جائیں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے چلو بکھر جائیں

(ریحانہ روحی)

میرے سفر میں وہ کبھی شامل نہیں رہا
شامل ہوا تو راہ سے واپس پلٹ گیا

(انجم عزیز قیصرانی)

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے؟
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے؟

(شفیق سلیمی)

مسافتیں بھی عجب ہیں کہ طے نہیں ہوتیں
سفر کے بعد بھی میں نے سفر کی ٹھانی ہے

(نعمان منظور)

یہ کیا منزل ہے؟ جیسے جیسے قربت بڑھتی جاتی ہے
مسافر کیلئے راہِ مسافت بڑھتی جاتی ہے

(حسین سحر)

سفر ہی ختم ہوا اور نہ راستا ٹھہرا
کہاں پہ تھی مری منزل کہاں میں آ ٹھہرا

(طارق بٹ)

ہمارے پاؤں میں تحریر ہیں سفر اتنے
کوئی پڑاؤ نہ گھر ہے ہماری قسمت میں

(نسیم سحر)

کہا کس نے کہ ہم ہیں اپنے بام و در سے وابستہ
مسافر کب بھلا ہوتے ہیں اپنے گھر سے وابستہ؟

(حسین سحر)

بس یہی ہے کہ چل رہا ہوں میں
اور ابھی میرا گھر نہیں آیا

(سعید قیس)

سفر تھا پانیوں کا اپنی منزل کیوں زمیں ہوتی
سو اب کے اپنی کشتی آپ ہی غرقاب کی ہم نے

(نسیم سحر)

کیا جانیں کہاں لے کے اڑیں مجھ کو ہوائیں
سوکھے ہوئے پتے کی طرح ڈول رہا ہوں

(اقبال فرید)

جہاں بھی جائیں جدھر جائیں سب نگران کے
مسافر اپنی کوئی سرزمیں نہیں رکھتے

(حسین سحر)

تقدیر نے دکھائے کچھ ایسے عجیب رنگ
بچپن سفر میں گزرا جوانی سفر میں ہے

(شوکت علی ناز)

لپٹی ہیں آج قدموں سے اتنی مسافتیں
اگلا قدم کہاں ہو بھروسا نہیں کوئی

(طارق بٹ)

اندھیرا ذہن میں ہوتا ہے راہوں میں نہیں ہوتا
سفر میں روشنی کا استعارہ سوچتے رہنا

(ذکاء صدیقی)

دشت.....صحرا.....دھوپ:

وقت کی صحرا نوردی یوں تو لے ڈوبی مگر
کیسے کیسے پانیوں کے ہم شناور ہوگئے

(شہزاد قمر)

ہم اپنے گھر کا رستا بھول کر صحرا میں آنکلے
بجھانے پیاس اپنی ریت کے دریا میں آنکلے

(حسین سحر)

نہ پوچھیں کن فضاؤں میں اڑانیں ہیں خیالوں کی
کہیں دینار و درہم کی کہیں باتیں ریالوں کی

(ممتاز راشد)

چار جانب ہم سرابوں میں گھرے ہیں اس قدر
پیاس کے صحرا میں پانی کی طلب کوئی نہیں

(حسین سحر)

گل کھلے ہیں آج طارق دشت میں
فیض میری آبلہ پائی کا ہے

(طارق محمود)

گلشن ہے ان کی دنیا میرا وجود صحرا
ان کا نصیب خوشیاں میرا نصیب آنسو

(زمرد سیفی)

کیا کھلیں گے اس میں خوشبو کے گلاب
غم کا صحرا ہے مرے چاروں طرف

(کمال اظہر)

میں نے لکھا کہ لق و دق ہے یہ صحرائے وجود
اس نے صحرا کو پڑھا کاٹ کے ذرہ لکھا

(نعیم بازید پوری)

حسرتِ تعمیر:

راشد یہ زندگی تو سفر میں ہی کٹ چلی
حسرت ہے اپنے نام کا اک گھر بھی دیکھ لیں

(راشد عباسی)

خوشبو کے سائبان بنانے میں کٹ گئی
عمر عزیز سر ہی چھپانے میں کٹ گئی

(اقبال نواز)

گھر بنایا پہ رہ نہ پائے کبھی
ایسے بن باسیوں کا ذکر نہ کر

(ظفر مہدی)

ابھی کچھ اور سہنی ہے مجھے پردیس کی وحشت
ابھی بچے بھی چھوٹے ہیں مکاں بھی نامکمل ہے

(ممتاز ارشد)

حمد و نعت:

نسیم اکثر جو ہم بادیدۂ تر حمد کہتے ہیں
تو ہر قطرے میں کتنے ہی سمندر حمد کہتے ہیں

(نسیم سحر)

میں کہ شہرِ نبی کا مکیں ہوں
کیا بتاؤں کہ کتنا حسیں ہوں

(خالدعباس اسدی)

کیا دل میں اب خیال ہو حور و قصور کا
نظروں کے سامنے ہے مدینہ حضور کا

(اجمل نقشبندی)

معراج سے بڑھ کر ہے یہ اعزاز بھی خادمؔ
سائے میں اگر گنبدِ خضرا کے گزر ہو

(خادم حسین خاکسار)

یہاں آب وہوا میں ذائقہ ہے باغِ جنت کا
اگر رہنے کے کوئی شہر ہے قابل مدینہ ہے

(حسین سحرؔ)

موت آجائے مدینے کی فضا میں مجھ کو
حشر کے دن اسی مٹی سے اٹھایا جاؤں

(حسین سحرؔ)

سرحد شہر مدینہ وہی ہوگی کہ جہاں
بڑھتے بڑھتے یہ مرا قافلۂ دل ٹھہرے

(قمر حیدر قمر)

باب دوم:

دبستانِ خلیج کی مختصر تاریخ

۱۹۳۰ء کی دہائی میں خلیج کے خطے میں پٹرول کی دریافت ہوئی۔تو یہاں تارکینِ وطن کی آمد کا آغاز ہوا۔برصغیر پاک وہند سے بھی لوگ تلاشِ روزگار میں اس علاقے میں پہنچے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اور بالآخر ۱۹۷۰ء کے بعد سے پاکستان۔ بھارت اور بنگلہ دیش سے تارکین کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچی۔ان میں اکثریت اُردو بولنے والوں کی تھی۔ان کا معاشرتی میل جول ہوا۔تو مقامی باشندوں نے بھی اُردو زبان میں دلچسپی لینا شروع کی۔اور آج ماشاءاللہ خلیجی ممالک میں عربی اور انگریزی کے بعد اُردو تیسری بڑی زبان کے طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہاں خاص طور پر سعودی عرب اور امارات میں نہ صرف ہندوپاک کے اخبارات ورسائل پڑھے جاتے ہیں بلکہ خود ان ممالک میں بھی اُردو کے اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔اُردو کے فروغ کے سلسلے میں ان اخبارات کے علاوہ یہاں کے اداروں کے سر اس کا سہرا ہے۔ان میں سرفہرست ہندوپاک کے وہ اسکول ہیں جو ان علاقوں میں قائم ہیں۔جہاں اُردو بولنے والوں کے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد زیرِ تعلیم ہے اس کے علاوہ یہاں کے ادبی اداروں کا بھی اس فروغ میں خاص ہاتھ ہے۔

اُردو ادب کے فروغ واشاعت کے سلسلے میں ان تمام اداروں کی مساعی الحمدللہ اب تک جاری وساری ہیں۔

باب سوم:

دبستانِ خلیج کا فروغ

ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کسی بھی زبان کے فروغ میں خاص کردار ادا کرتے ہیں اور خلیجی ممالک میں بھی اُردو کے فروغ میں یہ ادارے مؤثر انداز میں کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ سعودی ریڈیو مکہ کے علاوہ امارات میں دبئی اور ابوظہبی کے ایف ایم ریڈیو۔ اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پھر جدہ سعودی عرب سے اُردو نیوز اُردو میگزین اور ''سحاب'' دبئی سے الشرق کے علاوہ مختلف اُردو رسائل اور اخبارات وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ ''آواز'' ماہنامہ ادبی سلسلہ مرتب سجاد سلیم (ریاض۔ سعودی عرب)

۲۔ ادبی ڈائجسٹ۔ مرتبہ طاہر پرویز۔ کویت

۳۔ پیامِ صحرا (ادبی مجلّہ) مرتبہ صفدر حسین ۱۹۹۱ء ریاض (سعودی عرب)

۴۔ خبر نامہ سفارتخانہ پاکستان۔ ریاض (سعودی عرب)

۵۔ خیال آفریں (ششماہی) مرتبہ احمد امیر پاشا (بحرین)

۶۔ خیال و فن (سہ ماہی مجلّہ ۱۹۹۵ء) مرتبہ ممتاز راشد۔ قطر

۷۔ دنیائے اُردو۔ مرتبہ مختار علی جدہ (سعودی عرب)

۸۔ دی ٹیلنٹ۔ مرتبہ منشا طاہر۔ الخبر (سعودی عرب)

۹۔ سحاب (ششماہی ادبی مجلّہ) مرتبہ نسیم سحر۔ جدہ (سعودی عرب)

۱۰۔ شعر و سخن۔ مرتبہ فرح جعفری۔ الخبر

۱۱۔ عربین پوسٹ۔ مرتبہ منظور بھٹی۔ دبئی

۱۲۔ نشاط۔ مرتبہ صابر عمر و افروز عالم۔ کویت

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر دمام سے وسیلہ (مرتبہ محمود شاہد) امارات سے ''اُردو منزل'' (مرتبہ صبیحہ صبا اور صغیر جعفری) اور دبئی سے آن لائن انٹرنیشنل (مرتبہ سلیمان جاذب) یہ خدمت انجام دے رہے ہیں علاوہ ازیں ''تخلیق'' لاہور ''شاعر'' بمبئی ''شگوفہ'' حیدرآباد دکن اور ''دنیائے ادب'' کراچی خلیج کے سلسلے میں خاص اشاعتیں منظرِ عام پر لا چکے ہیں۔

رسائل و جرائد کے علاوہ دبستانِ خلیج کے فروغ و اشاعت میں اُن مرتبہ کتب کا بھی اہم حصہ ہے۔ جو اس علاقے سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کتب میں یہاں کے اہلِ قلم کے تذکرے کے علاوہ ان کی منتخب تخلیقات بھی شامل ہیں۔ ان کتب کے مطالعے سے اس دبستان کے مجموعی مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ارمغانِ اعجاز (منطقہ شرقیہ سعودی عرب کے اُردو شعرا کا انتخاب) مرتبہ راشد عباسی ۱۹۹۷ء

۲۔ امارات میں اُردو۔ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۳۔ بحرین میں اُردو۔ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۴۔ بیرونی ممالک میں اُردو۔ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ مرتبہ انعام الحق جاوید ۱۹۹۸ء

۵۔ بین الاقوامی اُردو شاعری۔ مرتبہ باقی احمد پوری (کویت)

۶۔ جہات (سعودی عرب میں مقیم افسانہ نگاروں کا انتخاب) مرتبہ ڈاکٹر اقبال واجد

۷۔ دشت رنگ (سعودی عرب میں مقیم منتخب پاکستانی غزل گو شعرا کا تذکرہ) مرتبہ ڈاکٹر اقبال واجد

۸۔ ریت اور شبنم (ابوظہبی میں مقیم اردو شعرا کا انتخاب) مرتبہ اسلام عظمی ۱۹۸۱ء

۹۔ ریگِ رنگ (قطر کے شعرا کا انتخاب) مرتبہ شمیم حیدر جون پوری

۱۰۔ سعودی عرب میں اُردو۔ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ مرتبہ حنیف شاہد ۱۹۸۶ء

۱۱۔ سخنور (شعرا کا تذکرہ) مرتبہ سلطانہ مہر۔ امریکہ

۱۲۔ صحرا کی ٹھنڈی شامیں (قطر کے شعرا کا انتخاب) مرتبہ ممتاز راشد

۱۳۔صحرا میں گلاب ۔(سعودی عرب کے اہل قلم کا انتخاب)مرتبہ حسین سحر۔شمشاد صدیقی ۔سجاد ظہیر ۱۹۹۸ء

۱۴۔صدا بصحرا (امارات کے شعرا کا تذکرہ)مرتبہ سجاد بابر ۱۹۸۰ء

۱۵۔غریب الوطن ادیب ۔مرتبہ ڈاکٹر فہیم اعظمی

۱۶۔قطر میں اُردو۔مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۱۷۔کویت میں اُردو۔مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۱۸۔کہکشاں ۔(بحرین کے شعرا کا تذکرہ)مرتبہ عبدالحق عارف ۱۹۹۲ء

۱۹۔مشرق وسطی میں اُردو۔مرتبہ قمر حیدر قمر۔راشد فضلی،بشیر مرزا۔شمس الحق نوشاد۔۱۹۹۳ء

۲۰۔مقیاس ۔(قطر کے شعرا کا انتخاب)مرتبہ وحید بخش غیاث ۱۹۸۹ء

۲۱۔منتخب غزلیں (صاحب کتاب خلیجی شعرا کا انتخاب)مرتبہ ممتاز راشد

ادبی انجمنیں اور ادارے:

زبان وادب کے فروغ میں ادبی انجمنوں اور ادبی اداروں کا بڑا حصہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ دبستانِ خلیج کے فروغ میں اس خطے کے ادبی اداروں اور انجمنوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں یہ ادارے خاص طور پر قابل ذکر ہیں اردو اکیڈمی (جدہ) اوورسیز پاکستانی رائٹرز فورم (ریاض) اردو مرکز (جدہ) ادارہ سحاب (جدہ) ادبی اجالا (خواتین ۔جدہ) ادارہ فروغ اُردو ادب (قطر) انجمن خواتین پاکستان (ریاض) اقبال سٹڈی سرکل (جدہ) بزم احباب دکن (ریاض) بزم جگر (جدہ) بزم اودھ (جدہ) بزم حیدر آباد (تبوک) بزم سخن (مدینہ منورہ) بزم سخن (بحرین) بزم اقبال (ریاض) بزم فانوس (ریاض) پاکستان رائٹرز فورم (ریاض) پاکستان رائٹرز فورم (جدہ) پاکستان سوشل سوسائٹی (ریاض) پاکستانی فورم (ریاض) پاکستان کلچر گروپ (ریاض) پاکستان ایسوسی ایشن (دبئی) پاکستان سوشل سنٹر پاکستان کلب (بحرین) حلقہ فکر وسخن (دمام ۔ریاض) حلقہ ارباب ذوق (ریاض) حلقہ ارباب ذوق (جدہ) حلقہ ارباب ذوق (شارجہ) حلقہ ادب (بحرین) حلقہ شعرائے اہل بیت (شارجہ) خاک طیبہ ٹرسٹ (جدہ) دائرہ ادب (جدہ) دائرہ

ادب اسلامی (دمام ۔ریاض) سلسلہ (خواتین ۔جدہ) فرینڈز فورم ۔الخبر کاروانِ فکر (جدہ) مجلس اقبال (ریاض) مجلس علم وادب (جدہ) مجلس محصورین (جدہ) دبستانِ ادب (الخبر) ہندوستانی بزم اُردو (ریاض) ہم ہندوستانی (ریاض)

مشاعروں کا انعقاد:

زبان وادب کی اشاعت میں مشاعروں کا اپنا کردار ہے ۔مشاعروں سے جہاں عام سامعین میں شعر کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے ۔وہاں شعرا کے فن کو نکھارنے میں بھی ایسے ادبی اجتماعات کی اپنی اہمیت ہے ۔خلیجی ممالک کے مشاعرے اس سلسلے میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی گونج برصغیر تک صاف محسوس کی جاسکتی ہے ۔یہاں گزشتہ چالیس سال سے متعدد مشاعرے منعقد ہوئے ہیں جن کی تاریخی حیثیت ہے اس سلسلے میں بحرین جدہ جبیل، دبئی، ابوظہبی، شارجہ، دمام، ریاض، قطر اور کویت کے مشاعرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

نظامت:

ان مشاعروں اور ان کے علاوہ دیگر ادبی تقاریب کی نظامت بھی ایک فن ہے اور اس سلسلے میں یہاں جن لوگوں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ۔ان کے نام یہ ہیں ۔آغا طالب، ابوظفر، احمد سعود قاسمی، اشفاق احمد، افتخار نقوی، اقبال اعجاز بیگ، اقبال قمر، انجم ڈار، حمید غیبی، حافظ عبدالوحید، شمشاد صدیقی، شمیم جونپوری، ظہور الاسلام جاوید، غضنفر رضوی، فراست علی خسرو، کرار حسین، ناظر قدوائی، نسیم سحر، نصرت مرزا اور یوسف علی ۔

صحافت:

اسی طرح یہاں کی صحافت میں جو نام نمایاں ہیں وہ کچھ یوں ہیں ۔ابوظفر، اعجاز طاہر اعوان، اسحاق نسیم رانا، اطہر ہاشمی، افطار حسین کاظمی، بینا سعد، پرویز شیخ، جاوید اقبال، حشام احمد، رشید الحسن، رشید جنید، رشید انصاری، رؤف طاہر، سمیرہ عزیز، شمشاد صدیقی، شہزاد اعظم، شہلا ہاشمی،

طارق غازی،غوث ارسلان،فرقان نقوی، کے این واصف،گل محمد بھٹہ،لئیق اللہ خان،منیر طاہر، مہاعبدالعزیز،نظرحجازی،نعیم اعوان،نعیم بازیدپوری،اوریوسف رحیم بیدری۔

مشاہیر کی آمد:

مشاعروں اورادبی تقاریب میں مختلف اوقات میں یہاں کی ادبی انجمنیں برصغیر سے متعدد معروف اہل قلم کومدعوکرتی ہیں جن کے افکار سے جہاں یہاں کے سامعین مستفید ہوتے ہیں۔ وہاں مشاہیرکوبھی یہاں کے اہل قلم کے ادبی مزاج سے آشنائی ہوتی ہے۔اس سلسلے میں جومشاہیر بطور مہمان وقتاً فوقتاً یہاں تشریف لاتے رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔اشفاق احمد،اطہرشاہ خاں (جیدی)امجد اسلام امجد،انعام الحق جاوید،انورجلالپوری،انورمسعود،انورمقصود،بشیربدر،بیکل اتساہی، بیگ احساس،توصیف تبسم،جمیل الدین عالی،حفیظ جالندھری،خمارباره بنکوی،دلاورفگار راحت اندوری،سرفرازشاہد،شہریار،صلاح الدین،ضمیرجعفری،عبدالجبارشاکر،عرفان صدیقی، عطاءالحق قاسمی، عنایت علی خاں،قاسم پیرزاده،کلیم عاجز،گوپی چندنارنگ، ماہرالقادری،مختار مسعود،مخمورسعیدی،مشتاق احمدیوسفی،مشکورحسین یاد،مظہرامام،مظفرحنفی،مغنی تبسم،ملک زاده منظور، منظربھوپالی،نوازدیوبندی اوروصی شاہ۔

باب چہارم:

دبستانِ خلیج کا ارتقاء

جیسا کہ پہلے عرض کیاجاچکا ہے۔آج سے چالیس سال پہلے خلیجی ممالک میں اردو لکھنے والے اہل قلم کی آمدہوئی۔تو ان میں زیادہ تعدادشعرا کی تھی۔چنانچہ آغاز ہی میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔پھر جیسے جیسے لوگ آتے گئے دیگراصناف ادب کی طرف بھی توجہ ہوتی گئی اور اب ماشاءاللہ کوئی صف ایسی نہیں۔جس میں لکھنے والے یہاں موجود نہ ہوں۔البتہ شاعری اور خاص طور پرغزل کی شاعری کا پلڑا اب بھی بھاری نظر آتا ہے ہم کوشش کریں گے کہ یہاں اختصار کے ساتھ تمام اصناف کا احاطہ کرسکیں۔

غزل:

یہ صنفِ سخن سب سے زیادہ مقبول اورمروج ہے۔غزل کے شعرا میں جونام زیادہ ابھرکر سامنے آئے یہاں ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔آفتاب ترابی،ابوطالب اینم،احمدصغیرصدیقی،احمدجمال صادق،افضل آرش،افتخارراغب،اقبال فرید،اقبال طارق،اقبال طالب،اقبال نواز،اقبال قمر، اطہرنفس عباس،اعتمادصدیقی،اقبال اعجاز بیگ،اکرم زاہد،اعجاز شاہین،انجم عزیز قیصرانی،پرویز احمد، پرویز اختر،تنویراحمدتنویر،تسلیم الہی زلفی،تسنیم عابدی،ژوف زہرا،ژوت زیدی، جاوید اختر جاوید،حامدکرتارپوری،حسین سحر،حبیب مظفر ہاشمی،حنیف ترین،حیدراعظمی،خالدعباس اسدی، خلیل الرحمٰن،زمردسیفی،زبیرفاروق،ذکاءصدیقی،رحمت اللہ جری،راشدفضلی،راشدعباسی،رشید نیاز،ریحانہ روحی،زین صدیقی،سرفرازعلی حسین،سعیدمنتظر،سحراکبرآبادی،سعیدقیس،سعیدہ روشن، سلیم کاوش،سجادبابر،سجادسلیم،سہیل ثاقب،سحرتاب،شوکت علی ناز،شاہدنجیب آبادی،شفیق ندوی، شفیق سلیمی،شبنم منارووی،شاہ زماں کوثر،شجاعت علی راہی،شہزادقمر،صادق شاد،صبیحہ صبیا،صغیر

جعفری، ضیا خان، طارق بٹ، طارق محمود طارق، طاہر جمیل، ظفر مہدی، ظہور الاسلام جاوید، عبدالباری انجم، عبدالحق عارف، ع۔س۔مسلم، عبدالحمید امیری، عبدالرزاق صدف، عبداللہ ساجد، عرفان اعظمی، عذرا نقوی، غنی عاصم، فرزانہ سحاب، فراست علی خسرو، قمر حیدر قمر، کمال اظہر، مختار علی، مسرت جبیں، مصدق لاکھانی، مظہر قسیم، منور ہاشمی، ممتاز راشد، مشتاق شاد، مجاہد سید، نعمان منظور، نعیم حامد علی، نسیم سحر، نعیم بازید پوری، ناز مظفر آبادی، واصل عثمانی، وقار نسیم وامق، یوسف علی، یونس اعجاز اور یونس قاضی۔

نظم:

نظم کی طرف یہاں کے اہل قلم کی اگر چہ غزل جیسی توجہ نہیں تاہم یہاں کچھ ایسے شعرا موجود ہیں جن کا نظم میں اپنا ایک مقام بن چکا ہے۔یہ شعرا زیادہ تر پابند نظم کہتے ہیں۔تاہم کچھ نظم آزاد اور نثری نظم میں بھی طبع آزمائی کر رہے ہیں نظم کے شعرا میں درج ذیل نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔تبسم محسن علوی، ثروت زہرا، حبیب صدیقی، حشام احمد، خورشید علیگ، سید ذوالکفل بخاری، ریحان اظہر، راشد فضلی، رسول احمد کلیمی، رؤف خلش، ستیہ پال آنند، شبنم منا روی، شفیق ندوی، صلاح الدین پرویز، ع۔س۔مسلم، عذرا نقوی، غفار حسینی، فرتاش سید، کاوش عباسی، محسن علوی، نسیم سحر اور نصیر احمد ناصر۔

دینی ادب:

دینی ادب میں حمد و نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ شامل ہیں خلیجی ممالک میں عام مشاعروں کے علاوہ نعتیہ مشاعروں اور مسالموں کی روایت بھی موجود ہے۔جہاں شعرا اپنے نذرانہ ہائے عقیدت پیش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جن شعرا نے خاص توجہ دی ہے ان کے نام یہ ہیں ابو طالب، انیم، ابوتراب، انجم آکہ آبادی، اجمل نقشبندی، اقبال سندھو، اقبال اعجاز بیگ، اقبال گیلانی، افتخار راہب، ابو طالب نقوی، تہذیب عباس، تنویر الحسن تنویر، حسین سحر، حسین انجم، خالد عباس اسدی، زمرد سیفی، سبطین شاہجہانی، سرفراز علی حسین، سلیم عباس، سلطان حیدر، شجاعت

عباس، ضیغم زیدی، عاطر صدیقی، عبدالمالک مجاہد، ع۔س۔مسلم، غنی عاصم، فیض کوثر، قمر حیدر قمر، قیصر جعفری، کمال اظہر، منظر زیدی، مصدق لاکھانی، مرزا علی مرتضیٰ، محسن علوی، ممتاز راشد، مقصود تبسم، منور ہاشمی، نور محمد جرال، نسیم سحر، نورین طلعت عروبہ، نسیم کاظمی، ناصر الہ آبادی، نذیر عابدی، نصیر عارف، ولی لکھنوی اور یوسف مرزا پیر۔

افسانوی ادب:

افسانوی ادب میں عام طور پر افسانہ اور ناول شامل ہیں۔ان اصناف میں خلیج میں مقیم جن ادیبوں نے نام پیدا کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔ابو نبیل خواجہ مسیح الدین، اسلام عظمی، ایم ایم ادیب، اشرف شاد، بشیر مرزا، ریحان اظہر، سمیرہ عزیز، سلیم خان، شاہین نظر، صلاح الدین پرویز، طہ آفندی، عذرا نقوی، عاصم صدیقی، ع۔س۔مسلم، فہیم اعظمی، فرحت پروین، کرامت غوری، کبیر خاں، محمود شاہد، محمود عالم، مجید سلیم، نور حسین شاہ، نگار سجاد، نجم الحسن رضوی اور نگہت مرزا۔

طنز و مزاح:

نظم و نثر کے شگفتہ ادب یعنی طنز و مزاح کے سلسلے میں جن اہل قلم نے اپنی حیثیت منوائی ہے۔ان میں یہ نام شامل ہیں۔اقبال شانہ، اسد جعفری، ابوالفرح ہمایوں، جعفر رضوی، خادم حسین خاکسار، سگار لکھنوی، سید احمد راجا، شکیل آزاد، شوکت جمال، شجاع الدین غوری، صفدر حسین، ظفر اقبال کھوکھر، عابد معز، علیم خان فلکی، غوث ارسلان، غیاث صدیقی، غلام فرید بھٹہ، فرزانہ سحاب، کمال اظہر، کبیر خان، مرزا سلطان بیگ، ممتاز راشد، مہزاد سحر، نعیم جاوید، ناظر قدوائی، نسیم سحر، نجم الحسن رضوی اور یوسف مرزا رہبر۔

انشائیہ:

انشائیہ نگار اہل قلم میں یہ نام نمایاں ہیں۔اقبال اعجاز بیگ، بشیر مرزا، صفدر حسین، ظفر اقبال کھوکھر، عابد معز، غلام فرید بھٹہ، غیاث صدیقی، صادق رضاوی، مہزاد سحر اور یوسف مرزا رہبر۔

سفر نامہ:

حسین احمد پراچہ، خورشید انور، ریحان اظہر، ع۔س۔مسلم، فرزانہ اعجاز، نگار سجاد ظہیر

اور یوسف مرزا رہبر۔

خاکہ نگاری:

اقبال قمر، بشیر مرزا، سجاد ظہیر، صفدر حسین، عابد معز، فرزانہ اعجاز، کبیر خاں، مبز ادسحر محمود عالم، نعمان منظور اور ہارون پاشا۔

کالم نگاری:

مقامی اخبارات میں جن لکھنے والوں نے کالم نگاری میں ایک خاص مقام حاصل کیا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ جاوید اقبال، حسین احمد پراچہ، رؤف طاہر، عابد معز، ع۔س۔مسلم اور نظر حجازی۔

بچوں کا ادب:

نظم ونثر میں بچوں کیلئے جن اہل قلم نے خاص طور پر لکھا ہے ان میں یہ نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ اقبال نواز، حسین سحر، زین صدیقی، سبطین شاہجہانی، شجاعت علی راہی، شہزاد سحر، صفدر حسین، ع۔س۔مسلم، محمود عالم، محمود خاور، مبز ادسحر اور نور حسین شاہ۔

تنقید.....تحقیق.....تبصرہ.....تاریخ:

نثر میں تنقید، تحقیق، تبصرہ اور تاریخ کے میدان درج ذیل اہل قلم کے نام نمایاں ہیں اجمل اصلاحی، اقبال واجد، اوصاف احمد، انیس الرحمٰن، اقبال اعجاز بیگ، آصف رشید الحسن، امتیاز بلوچ، بیا سعد، حسین سحر، حنیف شاہد، حسن نظیر جعفری، خالد عباس اسدی، ذیشان حیدر جوادی، رشید انصاری، شفیق ندوی، شاہد نجیب آبادی، شعیب نگرامی، صالحہ جواد الموسیٰ، ظفر اقبال ظفر، عطیہ خلیل عرب، عمران بلخی، عطاء الرحمٰن صدیقی، غیاث صدیقی، ف۔عبدالرحیم محمود عالم، منور ہاشمی، محمود شاہد، نعیم حامد علی، نسیم سحر، نگار سجاد ظہیر، نور حسین تنویر، واصل عثمانی، وحید مرزا اور یوسف رحیم بیدری۔

ترجمہ:

مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمے کے فرائض ادا کرنے والے اہل قلم یہ ہیں۔ اجمل اصلاحی، حسین سحر، ذاکر ندوی، شفیق ندوی، صفدر حسین، ف۔عبدالرحیم، فہیم جاوید، کاوش عباسی، محمود عالم، محمد اقبال، نعیم بازید پوری، نسیم سحر اور وسیم اختر بلال قاسمی۔

باب پنجم:

تذکرۂ اہل قلم

عرب شعراء:

عرب شعرا جو اُردو میں بھی شعر کہتے ہیں ان میں، ابراہیم العریض عنایت، زبیر فاروق، سعید شرعبی، عمر سالم العیدروس، سمیر عبدالحمید، محمد ابن خلیل عرب شکیب اور عبدالحمید امیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اہلِ قلم خواتین:

اہلِ قلم میں خواتین کا کردار بھی نمایاں ہے اور دبستانِ خلیج میں جن خواتین نے نام پیدا کیا ہے وہ یہ ہیں۔ تبسم محسن علوی، لبنواز عارف، ریحانہ روحی، سعدیہ روشن صدیقی، سعدیہ ضیغم، سمیرہ عزیز، شبنم بخاری، شمع ظفر مہدی، صالحہ جواد الموسیٰ، عابدہ کرامت، عذرا نقوی، عطیہ خلیل عرب، فرزانہ سحاب، فرزانہ اعجاز، فرحت پروین، گلنار آفرین، مسرت جبیں زیبا، نجمہ شاہین نجمی، نگار سجاد ظہیر، نگہت مرزا حنا، نورین طلعت عروبہ اور یاسمین حمید۔

رفتگاں:

جو اہلِ قلم وفات پا چکے ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔ احمد سعود قاسمی، اعتماد صدیقی، اقبال فرید، پرویز اختر، حسن نظیر جعفری، حسین انجم، حامد کرتارپوری، خوشنود بخاری، رانا عبدالرزاق، ذکاء صدیقی، سید ذوالکفل بخاری، ذیشان حیدر جوادی، سجاد ظہیر، سلیم جعفری، شبنم مناروی، صفدر حسین، ضیغم زیدی، ظفر اقبال کھوکھر، ظفر مہدی، غضنفر رضوی، فہیم اعظمی، مختار احمد کاشف، مشتاق شاد، مصیب الرحمٰن، مظہر قسیم، محمود عالم، محمد بن خلیل عرب شکیب۔

وہ جو لوٹ گئے:

وہ اہلِ قلم جو خطۂ خلیج کے ممالک میں کچھ عرصہ قیام کر کے واپس اپنے وطن لوٹ گئے وہ یہ

ہیں ۔آشفتہ چنگیزی، ارمان نجمی، احمد جمال صادق، اسلام عظمی، اطہر ہاشمی، افتخار بارک، انجم الہ آبادی، انور نسیم، اقبال نواز، برخیا ابوترابی، پرویز احمد، تسلیم الٰہی زلفی حنیف شاہد، خواجہ رحمت اللہ جری، راشد صدیقی، رشید الحسن، رشید صدیقی، رؤف صدیقی، رؤف خلش، ریحانہ روحی، رسول احمد کلیمی، سبطین شاہجہانی، ستیہ پال آنند، سحر اکبر آبادی، سجاد بابر، سگار لکھنوی، سلیم پراچہ، سلیم خان، سہیل فاروقی، شفیق سلیمی، شاہد نجیب آبادی، شجاعت علی راہی، شفق ہاشمی، شہزاد قمر، شکیل آزاد، صبا شیخانی، صبیحہ نوید، صلاح الدین پرویز، عابدہ کرامت، عاصم صدیقی، عائشہ رفعت، عذرا نقوی، عبدالمجید عاصی، عطاء الرحمٰن باغی، علی عباس اشعری، غیاث صدیقی، غنی عاصم، قیصر جعفری، قیوم طاہر، کاوش عباسی، کرامت غوری، گلنار آفریں، محمود خاور، مرزا سلطان بیگ، منظر زیدی، منظور ہاشمی، منیر پرویز، منیف اشعر، مرزا لیاقت بیگ نازش، نگار سجاد، ناظر قدوائی، نصیر احمد ناصر، نعمان منظور، نقوش نقوی، نور محمد جرال، واصل عثمانی، وحید مرزا، ہارون پاشا، ہمایوں اختر، یاسمین حمید، یوسف اعوان اور یونس اعجاز۔

موجودہ نمایاں اہلِ قلم

جو نمایاں اہل قلم ماشاءاللہ حیات ہیں اور خلیج کے مختلف ممالک میں حرمتِ قلم کا فریضہ اپنے اپنے انداز میں انجام دے رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔	اقبال قمر	سعودی عرب
۲۔	اقبال اعجاز بیگ	سعودی عرب
۳۔	تسنیم عابدی	امارات
۴۔	ثروت زہرا	امارات
۵۔	جاوید اختر جاوید	سعودی عرب
۶۔	حسین سحر	امارات
۷۔	خالد عباس اسدی	سعودی عرب

۸۔	راشد فضلی	سعودی عرب
۹۔	زبیر فاروق	امارات
۱۰۔	زین صدیقی	سعودی عرب
۱۱۔	سعدیہ روشن	امارات
۱۲۔	سعید قیس	بحرین
۱۳۔	سہیل ثاقب	سعودی عرب
۱۴۔	شفیق ندوی	سعودی عرب
۱۵۔	شوکت جمال	سعودی عرب
۱۶۔	صبیحہ صبا	امارات
۱۷۔	صغیر جعفری	امارات
۱۸۔	طارق محمود طارق	سعودی عرب
۱۹۔	ظہور الاسلام جاوید	امارات
۲۰۔	عاصم واسطی	امارات
۲۱۔	عطیہ خلیل عرب	امارات
۲۲۔	ع۔س۔مسلم	امارات
۲۳۔	فرحت پروین	سعودی عرب
۲۴۔	فرزانہ اعجاز	عمان
۲۵۔	قمر حیدر قمر	سعودی عرب
۲۶۔	کبیر خاں	امارات
۲۷۔	کمال اظہر	کویت
۲۸۔	مختار علی	سعودی عرب

۲۹۔ مصدق لاکھانی امارات

۳۰۔ مقصود تبسم امارات

۳۱۔ مہزاد سحر امارات

۳۲۔ مسرت جبیں زیبا کویت

۳۳۔ ممتاز راشد قطر

۳۴۔ ناز مظفر آبادی سعودی عرب

۳۵۔ نسیم سحر سعودی عرب

۳۶۔ نسیم کاظمی امارات

۳۷۔ نعیم بازید پوری سعودی عرب

۳۸۔ نعیم حامد علی سعودی عرب

۳۹۔ یوسف مرزا رہبر سعودی عرب

۴۰۔ یونس قاضی سعودی عرب

حقیقت یہ ہے کہ دبستانِ خلیج کے لکھنے والوں کی مجموعی تعداد 600 کے قریب بنتی ہے۔جن کی ملک وار تقسیم کچھ یوں ہے۔

سعودی عرب:	300	قطر:	50
متحدہ عرب امارات:	100	بحرین:	50
کویت:	50	عمان:	50

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ لکھنے والے سعودی عرب میں ہیں اور یہ ہونا بھی چاہئے کہ خلیجی ممالک میں رقبے اور وسائل کے اعتبار سے یہ سب سے بڑا ملک ہے۔تارکینِ وطن کی تعداد بھی اس نسبت سے یہاں سب سے زیادہ ہے۔چنانچہ لکھنے والے بھی اکثریت میں ہیں۔

صاحبِ کتاب اہلِ قلم

شمار	نام	ملک	تصانیف
1	ابراہیم العریض عنایت	بحرین	گلیاری (شاعری) 1990
2	ابونبیل خواجہ مسیح الدین	سعودی عرب	سائبان (افسانہ)
3	ابوالفرح ہمایوں	سعودی عرب	جوئے لطافت
4	اجمل نقشبندی	سعودی عرب	حضوری سے پہلے حضوری کے بعد (نعت)
5	اسلام عظمی	امارات	ریت اور شبنم (انتخاب) جوگ سنجوگ بہت پرانی کہانی 1990ء (شاعری)
6	افتخار راغب	قطر	خیال چہرہ
7	اقبال سندھو	کویت	ہوائے بطحا (نعت)
8	اقبال شانہ	سعودی عرب	بیاضِ فکر۔شانہ بہ شانہ (مزاحیہ شاعری)
9	اقبال طارق	بحرین	تمہارے قرب کے موسم (شاعری)
10	اقبال فرید میسوری	سعودی عرب	رنگِ دگر (شاعری)
11	اقبال قمر	سعودی عرب	شام کی زد میں (شاعری)
12	اقبال نواز	سعودی عرب	خوشبو کا لمس، آیاتِ عصر (شاعری) محبّ وحبیبؐ (حمد ونعت) بچپن لوکپن (بچوں کیلئے)
13	اقبال واجد	سعودی عرب	جہات (افسانوں کا انتخاب) دشت رنگ (مضامین)
14	انجم الہ آبادی	امارات	حسن کلام۔فتح مبیں (شاعری)
15	پرویز احمد	سعودی عرب	مرگیا ہدہد (شاعری)
16	پرویز اختر	سعودی عرب	سائباں ہاتھوں کا (غزل)
17	تسلیم الٰہی زلفی	سعودی عرب	شہر افکار۔دستاویز (شاعری)
18	ثروت زہرا	امارات	جلتی ہوا کا گیت (شاعری)
19	ثروت زیدی	سعودی عرب	پہلے کی طرح لوگ (شاعری)

20	جعفر رضوی	سعودی عرب	یونہی مذاق میں، بس ایک تبسم کیلئے (مزاحیہ شاعری)
21	حامد کرنا رپوری	کویت	مہر و نجوم ۔ ابر و بہار ۔ چاند مرا ہمسفر (شاعری)
22	حبیب صدیقی	سعودی عرب	حدیثِ گردشِ دوراں
23	حسین احمد پراچہ	سعودی عرب	کنارے کنارے (سفرنامہ)
24	حسین انجم	سعودی عرب	سنگِ جنوں (شاعری)
25	حسین سحر	امارات	تقدیس، تطہیر، تخاطب، تجلی، سعادت، مودت، تنویر، نظمیں، ستارہ و ہلال، کہرے میں دھنک، فرقان عظیم، شہرِ خواب، فانوسِ حرم، توصیف، تحسین، کتب نما، اظہار و بیان ۔ پھلکاری
26	حنیف ترین	سعودی عرب	رباب صحرا (غزل)
27	حنیف شاہد	سعودی عرب	قائداعظم اور اسلام
28	خالد عباس اسدی	سعودی عرب	متاعِ ہنر، بارگاہِ ادب (نعت) مدینۃ النبی کل اور آج، محمد اقبال (عربی میں کسی پاکستانی کی پہلی کتاب)
29	خواجہ رحمت اللہ جری	سعودی عرب	ضربِ لطیف 1998 خجیل دل 1993
30	خلیل الرحمٰن راز	قطر	نوائے راز (شاعری)
31	راشد فضلی	سعودی عرب	خواب آنکھیں (شاعری)
32	رسول احمد کلیمی	سعودی عرب	ہوائے دشت (شاعری)
33	رؤف خلش	سعودی عرب	نئی رتوں کا سفر، صحرا صحرا اجنبی (شاعری)
34	ریحان اظہر	سعودی عرب	کھوکھلے لوگ (افسانے) ہائے امریکہ وائے امریکہ (سفرنامہ) رابعہ زندہ ہے (ناولٹ) جانم (شاعری)
35	ریحانہ روحی	سعودی عرب	عشق زاد (شاعری)
36	ذکا صدیقی	سعودی عرب	آمنامہ (شاعری) آج کی شب پھر سنانا (شاعری)
37	زبیر فاروق	امارات	پس کہسار، سر کہسار، آیاتِ کرب
38	سبطین شاہجہانی	سعودی عرب	انمول موتی (بچوں کے گیت)
39	سجاد بابر	سعودی عرب	راہرو (شاعری) صدا صحرا (شعرائے امارات کا انتخاب)
40	سحر اکبر آبادی	کویت	طلوعِ سحر، شام و سحر (شاعری)

41	سعدیہ روشن صدیقی	امارات	روشنی ہماری ہے (شاعری) تحریک آزادی ایک مطالعہ
42	سعید قیس	بحرین	حدیثِ غم، سحر کے موسم، در و دیوار، محبت روشنی ہے
43	سعید نظر	کویت	غم کا سورج
44	سعید منتظر	سعودی عرب	دل منتظر ہے (غزل) توفیقِ ثنا (نعت)
45	سلیم خان	سعودی عرب	حصار (افسانے)
46	سمیرہ عزیز	سعودی عرب	رشتے بدل بھی جاتے ہیں (ناول)
47	سلطان حیدر	سعودی عرب	سجدۂ قلم (مرثیہ)
48	سہیل ثاقب	سعودی عرب	تیری میری آنکھوں میں (شاعری)
49	سلیم بیگ	سعودی عرب	مہکتی سرگوشی (شاعری)
50	شاہد نجیب آبادی	بحرین	رموزِ حسن، رمزِ عشق (شاعری) پٹھانوں کا آغاز (تاریخ)
51	شاہین نظر	سعودی عرب	سرکٹے لوگ (افسانے)
52	شبنم مناروی	سعودی عرب	خوابِ حیات، پانی پر بہتا پھول پنکھڑی اور گلاب
53	شجاعت علی راہی	سعودی عرب	برف کی رگیں، پھول کھلے یا نہ کھلے (شاعری) نرم شگوفے (بچوں کیلئے)
54	شفیق سلیمی	امارات	تمازت (شاعری)
55	شفیق ندوی	سعودی عرب	ہو نگر وعدہ وفا گل یہ کف نازمیں ۔ قریۂ جاں (شاعری)
56	شوکت جمال	سعودی عرب	دیوانچہ، شوخ بیانی، (مزاحیہ شاعری) 2003ء
57	شہزاد سحر	امارات	خزینہ معلومات (بچوں کیلئے)
58	صبیحہ صبا	امارات	لفظوں کا شہر
59	صفدر حسین	سعودی عرب	بازیچۂ اطفال، تمنا کا پہلا قدم (طنز و مزاح)
60	صلاح الدین پرویز	سعودی عرب	آڈیٹی کارڈ، سارے دن کا تھکا ہارا پرش، ایک دن بیت گیا نمرتا (ناول) سجی رنگ کے ساون، دشتِ تحیرات، پرماتما کے نام آتما کا پتر، کتابِ عشق (شاعری)
61	طارق محمود آفندی	بحرین	نقشِ حیات (افسانے) دشت کا سفر (ناول)
62	طارق محمود طارق	سعودی عرب	تیسرا موسم

63	ظفر مہدی	سعودی عرب	عکسِ جاں، زرخیز (شاعری) آتشِ رنگ
64	عابد معز	سعودی عرب	سنگ گزیدہ، واہ حیدرآباد (طنز و مزاح)
65	عاصم صدیقی	سعودی عرب	دیمک (افسانے)
66	عاصم واسطی	امارات	غزل تر احسان (شاعری)
67	عاطر صدیقی	قطر	شمعِ شبستاں (اسلامی نغمے) 1976
68	عبداللہ ساجد	کویت	درد آشنا، وقتِ رواں کا قافلہ (شاعری)
69	عبداللہ ناظر	سعودی عرب	گوہرِ شب تاب
70	عبدالحمید امیری	امارات	پری زاد اور میں عشق کے آنسو (شاعری)
71	عبدالمالک مجاہد	سعودی عرب	سنہری کرنیں
72	عذرا نقوی	سعودی عرب	آنگن جب پردیس ہوا (افسانے)
73	ع۔س۔مسلم	امارات	ایک ٹہنی کے پھول (افسانے) اوس اور کرنیں (شاعری) کاروانِ حرم، زبورِ نعت۔ برگِ تر۔ نیشِ گل۔ زمزمۂ سلام۔ زمزمۂ درود۔ حمدِ باری تعالیٰ
74	علی عباس اشعری	سعودی عرب	متاعِ جنوں (شاعری)
75	غزالہ شاہین	سعودی عرب	روح کو جگائے رکھنا (شاعری)
76	غنی عاصم	سعودی عرب	لب بستہ (غزل) امام شکستگاں (منقبت)
77	غیاث صدیقی	سعودی عرب	آوازکا رنگ قفسِ رنگ (شاعری) گونگا درد (مضامین)
78	فرناش سید	قطر	ہر ورق پر اسی کا نام (ہائیکو) 1992ء
79	فرحت پروین	سعودی عرب	منجمد، ریستوران کی کھڑکی سے (افسانے)
80	فرزانہ اعجاز	عمان	بھلائے نہ بنے (خاکے) تنہا تنہا (افسانے) حاضری کا شرف (سفرنامہ حج)
81	فرزانہ سحاب مرزا	امارات	شہرِ ذات (شاعری)
82	فہیم اعظمی	سعودی عرب	بہت دیر ہو چکی (ناول) پھر کیا ہو (افسانے) جنم کنڈلی (ناول) حصار (افسانے)
83	فیض کوثر	کویت	محمدؐ شمعِ محفل (نعت)

84	قاضی فراز احمد	قطر	زخمہ (غزل)
85	قمر حیدر قمر	سعودی عرب	چراغ سادہ آدمی (شاعری) ہمیں ان سے عشق ہے (دینی شاعری)
86	قیوم واثق	سعودی عرب	آئینہ صد رنگ (شاعری)
87	کبیر خاں	امارات	ہمہ یاراں دشت، کشمیر کا تاریک جغرافیہ (طنز و مزاح) قرض (ناول) چاند چہرے (خاکے)
88	کمال اظہر	کویت	کمالیات (مزاح) حرفِ عقیدت (حمد و نعت) دو آتشہ (شاعری)
89	گلنار آفریں	سعودی عرب	پلک پلک سمٹی رات (افسانے) حرفِ گل (شاعری)
90	مجاہد سید	سعودی عرب	حرفِ معتبر (شاعری)
91	مجید سلیم	سعودی عرب	بھنور بھنور زندگی (ناول) 1981 ..... سمندر (افسانے) 2001
92	مختار احمد کاشف	امارات	سوانح لال شہباز قلندر، مختصر تاریخ تصوف 1992ء۔ وہی یٰسین وہی طٰہٰ
93	محسن علوی	سعودی عرب	وارفتگی (حمد و نعت) دریچۂ دل (شاعری)
94	محمود بخاور	سعودی عرب	اثر لکھنوی حیات اور کارنامہ (تحقیق) ہوائی جہاز کی کہانی، پٹرول کی کہانی، ٹیپو سلطان شہید (بچوں کیلئے)
95	محمود شاہد	سعودی عرب	ڈھانچہ (افسانے)
96	محمود عالم	سعودی عرب	تنقیح و تشریح، تحصیل و ترسیل (تنقید) اردو ادب 77-76 جائزہ) لمحے بھر کا سفر، اک دل نا صبور (افسانے) عرب کا مجاہد ناولٹ زمانہ اس کو بھلا نہ دے
97	مختار علی	سعودی عرب	کتابِ آئندہ، کمیاب (شاعری)
98	مرزا یوسف رہبر	سعودی عرب	آ بیل ہمیں مار، گریباں کے چاک (طنز و مزاح) بات چل نکلی (انشائیے) دل ہی تو ہے (آپ بیتی) جانِ یوسف، لذتِ طلب، عقیدت (نعت) دیدۂ دل وا کرے کوئی (سفرنامہ حج)
99	مسرت جبیں زیبا	کویت	رخِ زیبا، پہلا آنسو موسم کا، چاہتیں بے اصول ہوتی ہیں، چلے بھی آؤ بہار رات ہے (شاعری)
100	مشتاق شاد	سعودی عرب	ریگ رنگ (غزل) لوک پرلوک (گیت)

101 مظہر تسیم — سعودی عرب — آسودگی اداس لمحوں کی (شاعری)

102 ممتاز راشد — قطر — کاوش (غزل) عقیدت خام (حمد و نعت) مذاق مذاق میں (مزاح)

103 منور ہاشمی — سعودی عرب — سوچ کا صحرا، کرب آگہی، بے ساختہ، نیند پوری نہ ہوئی (شاعری) لوح بھی تو قلم بھی تو (نعت) نخلستان (حکایات) نور ہدایت (سیرت) پردیسی کی یاد (ناولٹ)

104 مہر ادسحر — سعودی عرب — بدحواسیاں (بچوں کیلئے) وارے نیارے (مزاح)

105 ناز مظفر آبادی — سعودی عرب — بہار آنے تک۔ دسترس (غزل)

106 نجم الحسن رضوی — سعودی عرب — چشم تماشا 1982ء ہاتھ بیچنے والے 1994ء (افسانے) ہمارا بدمعاشی نظام (طنز و مزاح) 1999

107 نذیر فتحی — امارات — پتھراؤ، لاٹھی چارج (مزاح)

108 نسیم سحر — سعودی عرب — پہلی اڑان، ہر بوند سمندر، دریچۂ شب، روشندان میں چڑیا، جگنو دیئے ستارے، اک لطیف سرگوشی، اتنے اچھے موسم میں، پس انداز خواب سب سے الگ، چہرۂ خواب، (شاعری) یہ جو سلسلے ہیں کلام کے (نعت) لائن کٹ گئی (مزاحیہ شاعری) تراملنا ضروری ہے

109 نسیم کاظمی — قطر — امواجِ مدحت (مناقب)

110 نصیر احمد ناصر — سعودی عرب — زرد پتوں کی شال (ہائیکو) دسمبر اب مت آنا (شاعری)

111 نعیم حامد علی — سعودی عرب — پیکرِ نغمہ (شاعری)

112 نگار سجاد — سعودی عرب — مطالعہ تہذیب دشتِ امکاں، سوادِ شام سے پہلے (شاعری)، جدید ترکی، بارِ ہستی، دستِ قاتل (افسانے) مختار ثقفی، غلامی

113 نگہت مرزا حنا — سعودی عرب — سچائیاں (افسانے)

114 نور پرکار — کویت — موجِ شفق موج، غبار (شاعری) روپے کی موت، بھورو خاں، اگلے وقتوں کے دکھ، خالی پنجرے کی ہنسی (افسانے) سبزۂ بیگانہ، صبا آوارہ۔

115 نور حسین شاہ — قطر — موردِ الزام، آدم زادی (کہانیاں) گہن لگا چاند، کنول کھلا صحرا میں، دریعفت (ناول) کنول (بچوں کیلئے ناول)

116 نور محمد جرال — سعودی عرب — عینِ نور (نعت)

117 نور ملک — قطر — شہرِ غزل کفِ ہجراں (شاعری)

118 واصل عثمانی — سعودی عرب — شبلی ادیبوں کی نظر میں، شبلی نقادوں کی نظر میں، شبلی بلا و اسلام میں (تنقید و تحقیق) سب سخن مرے (شاعری)

119 ہارون پاشا — سعودی عرب — جان پہچان (خاکے)

120 یونس اعجاز — سعودی عرب — اڑان ٹوٹے پروں کی (شاعری)

121 یونس قاضی — سعودی عرب — آگہی کی تلاش (شاعری) 2002ء

باب ششم:

نمائندہ اہل قلم کا خصوصی مطالعہ

ذیل میں ہم دبستان خلیج کے نمایاں اہلِ قلم میں سے چند نمائندہ اہل قلم کا خصوصی مطالعہ ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں ۔ہم نے کوشش کی ہے کہ ان صاحب کتاب اہل قلم کو اس مطالعے میں شامل کیا جائے جو اس دبستان کی پہچان بن چکے ہیں اس کے علاوہ اس مطالعے میں ہم نے نظم ونثر کی مختلف اصناف کی بھی نمائندگی کی کوشش کی ہے ۔

یہ مطالعہ اور تجزیہ کسی صورت حرف آخر نہیں کیا جا سکتا ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ دبستان کے خدوخال نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے اہل قلم کے فکر وسخن اور ان کی شخصیت سے حتی الامکان انصاف کیا جائے ۔تاہم خوب سے خوب تر کی گنجائش بہر حال موجود ہے پھر یہ موضوع اسقدر وسیع اور طویل ہے کہ یہ مختصر کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔بہر حال موضوع سے متعلق ایک خاکہ سا ذہن میں ضرور بنتا ہے اور اس طرح پہلی بار اردو میں خلیج کے دبستان کا تصور ابھرتا ہوا نظر آتا ہے ۔

اقبال فرید.....ایک فنکار شاعر

منطقۂ شرقیہ سعودی عرب کے صحرا میں اردو شعروادب کی جو روشنی آج نظر آتی ہے ۔اس کے فروغ میں جناب اقبال فرید میسوری کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے کہ وہ ایک عرصے سے چراغ سخن کو اپنے خون جگر سے روشن کئے ہوئے ہیں ۔وہ ایک محفل آرا شخص ہیں جو شعری نشستوں کی ترتیب وانصرام کے ساتھ ساتھ ان کی نظامت اور نقابت کے فن سے بھی پوری طرح آشنا ہیں ۔

وہ بیک وقت شاعر' ادیب' مصور اور خطاط ہیں ۔اور ان کی یہی فنی حیثیات انہیں ایک خالص فنکار منوانے کے لئے کافی ہیں ۔خاص طور پر ٹائپ رائٹنگ کے ذریعے پورٹریٹ بنانے میں انہیں جو کمال حاصل ہے اس کا کوئی جواب نہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے اس فن کو عالمی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا ہے ۔لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کی شاعرانہ حیثیت ان تمام حیثیات پر حاوی ہے ۔کہ وہ اول و آخر شاعر ہیں ۔اور دیگر فنون ان کی اسی شاعرانہ شخصیت کی توسیع نظر آتے ہیں ۔

اقبال فرید کا خمیر شہید حریت حضرت سلطان ٹیپو رحمتہ اللہ علیہ کی مردم خیز سرزمین میسور سے اٹھا ہے ۔اس لئے ان کی شخصیت میں خلوص ومحبت اور غیرت وحمیت کے ساتھ ساتھ ایک درویشانہ وضعداری بھی شامل ہے ۔اور یہ سب اوصاف مل کر انہیں ایک ایسے نستعلیق انسان کا دلکش روپ عطا کرتے ہیں ۔جو سراپا خلوص اور مجسم محبت ہے ۔اس پر ان کی شاعری سونے پہ سہاگے کا کام دیتی ہے ۔

انہوں نے اگر چہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شاعری زیادہ تر غزل پر مشتمل ہے ۔اس سلسلے میں انہیں حضرت ضمیر عاقل شاہی اور ان کے بعد علامہ سیمابؒ کے فرزند ارجمند حضرت اعجاز صدیقی ایسے اساتذۂ فن سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے ۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جہاں جدید انداز فکر ملتا ہے وہاں روایت کا احترام اور اس کی پاسداری بھی اپنی جگہ پر ہے ۔مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھئے ۔ان میں ہماری غزل کی پختہ روایت رچی بسی نظر آتی ہے ۔

لہراتا اٹھا ہوں کسی مخمور کی صورت
رکھنا جو تھا مجھ کو مرے ساقی کا بھرم بھی

اب وہی سہارا ہو اپنے غم کی دنیا کا
تک رہا ہوں برسوں سے میکدے کا در تنہا

سونی پڑی تھی محفل ساقی پیر مغاں جیسے گم سم
ہم جو بڑھے میخانے کی جانب چیخ اٹھے ہیں پیالے چند

سچ تو یہ ہے کہ تیری آنکھوں نے
میکدے کو سنبھال رکھا تھا

ہم بہاروں میں کھو گئے ہوتے
راس آتے اگر نہ ویرانے

غزل عام طور پر شاعر کے اندرون کا فنی اظہار ہوتی ہے اور اس میں رمز و کنایہ دانش و حکمت' جذبہ و احساس' فکر و خیال اور ترنم و نغمگی کے ساتھ ساتھ غم ذات سے لے کر غم کائنات تک یک جان دکھائی دیتے ہیں۔صدیوں کے سفر کے بعد جدید غزل اپنے لہجہ و اسلوب کے لحاظ سے کتنی ہی آگے چلی جائے۔یہ خوبیاں اس میں بہر حال موجود رہیں گی۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں جدید تر شاعروں کے یہاں بھی کہیں کہیں خالص تغزل کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔اقبال فرید کا تغزل بھی اپنے عصر میں رہتے ہوئے انہی صفات کا حامل ہے۔مثلاً

جیسے ٹوٹے ہزار ہا تارے
کس غضب کی تھی اس کی انگڑائی

ذرا نظریں جھکا کر دیکھ لینا
کہ چوکھٹ پر رکھا ہے سر کسی کا

باندھ کر کھول ڈالا زحتِ سفر
اس کی آنکھوں میں پیار ایسا تھا

گر کے ملنا ہی ہے جو مٹی میں
پل دو پل چشم تر میں رہنے دو

اردو غزل میں خالص مصوری اور نقاشی کی کیفیات کبھی کبھی ضرور نظر آ جاتی ہیں۔لیکن جب کوئی عملی فنکار اپنے فن کو شعر کا روپ دیتا ہے تو اقبال فرید ایسے شاعر کے اشعار جنم لیتے ہیں۔وہ چونکہ ایک فنکار شاعر ہیں اس لئے ان سے بڑھ کر رنگوں اور خوشبوؤں کے مزاج سے کون واقف ہو سکتا ہے۔یہ شعر دیکھئے۔کینوس پر کسی فنکار کی رعنائی موقلم کا شہکار نظر آتے ہیں۔

تتلی کے سارے رنگ مری انگلیوں پہ تھے
رنگینی خیال کی سچائی بھی گئی

خوشبو اب بھی بول رہی ہے
اسی جگہ تھا اس کا گھر بھی

وہ خلوت میں بھی آجاتی ہے تنہا
نہیں خوشبو کو اس کی ڈر کسی کا

ہمارے ادب میں تقریباً ربع صدی سے ترکِ وطن، سفر، ہجرت، جلا وطنی اور پردیس کے مضامین عام ہیں۔لیکن غور کیا جائے تو تارکین وطن کی شاعری میں یہ تجربات ومشاہدات کہیں زیادہ وقیع اور وسیع معنویت کے آئینہ دار دکھائی دیتے ہیں اور یہ ہے بھی فطری کہ جگ بیتی سے آپ بیتی ہمیشہ زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔اقبال فرید کی غزل میں بھی یہ موضوع اپنے بسیط تناظر کے ساتھ موجود ہے۔

اپنی گلیوں میں تو ہم بدنام تھے
شہر سے نکلے تو پھر جو ہر کھلے

باندھ چکے تھے رختِ سفر بھی
نظریں تھیں دروازے پر بھی

کاش اپنے شہر میں دو چار بھی ملتے فرید
ہم وطن سے دور تھے تو مہربان کتنے ملے

آس تھی بھول تھی قسمت تھی پتا کچھ نہ چلا
ہم تو صحرائی ہوئے اپنے گھروں کے ہوتے

کہہ رہے ہیں میرے بچے میرا گھر
لوٹ کر اب آ بھی جا اے زندگی!

ترکِ وطن کا یہ جاں گداز تجربہ مسافر کو جہاں نئے نئے آفاق کی طرف گامزن کرتا ہے، وہاں اس پر سفر کی نئی نئی جہتیں بھی کھلتی ہیں اور یوں اس کی ذات میں تحرک کا عنصر زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔زندگی جمود سے حرکت کی طرف رواں دواں نظر آتی ہے۔اقبال فرید کا سفر بھی تحریک وتحرک کا پیغام ہے۔

محبت کی نہیں ہے کوئی منزل
محبت جستجو ہے اور کیا ہے؟

کیا جانیں کہاں لے کے اڑیں مجھ کو ہوائیں
سوکھے ہوئے پتے کی طرح ڈول رہا ہوں

ہے کون جو آئے مری تنہائی کو بانٹے
صحرا کا شجر ہوں بڑی مدت سے کھڑا ہوں

ہو جستجو تو منزلیں ہر ہر قدم میں ہیں
دل سے خیال ختم سفر ہی نکال دو

تم تھے شاہین صفت آج ہوا کیا تم کو؟
کیوں ہے کوتاہی پرواز پروں کے ہوتے؟

دیکھ لیں پہلے ذرا تازہ ہواؤں کے مزاج
ہو اگر طاقت پرواز تو پھر پر کھولیں

ہم بھی آگے بڑھتے رہے ہیں
بڑھتی رہی ہے راہ گزر بھی

میں نے پہلے کہا ہے کہ غزل شاعر کے اندرون کا فنی اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی حقائق و معارف اور ان کی تحلیل و تعبیر کا جو اسلوب اور پیرایہ غزل کو حاصل ہے، اتنا کسی اور صنفِ سخن کو شاید نہ ہو کہ غزل تو ہے ہی ذہنی واردات اور قلبی احساسات کی ترجمانی کا نام۔ اقبال فرید کی غزل کا یہ پہلو دیکھئے۔

یہ دنیا ہے اگر خوابوں کی بستی
تو پھر خوابوں میں کھونا چاہتا ہوں

ہنگامۂ ہستی میں جو میں ڈوب گیا ہوں
دنیا یہی کہتی ہے تمہیں بھول گیا ہوں

اس کا غصہ اسی کو لے ڈوبا
آگ میں اپنی جل گیا سورج

کسی کے وعدۂ فردا میں گم ہوئے اتنے
ہمیں نہ ہوش رہا کب نکل گئی تاریخ

پھر کوئی عکس ابھرنے نہیں پائے اس میں
دل کے آئینے پہ وہ دھول جما دی جائے

ہنسی سے کیا مری واضح نہیں ہے؟
میں تازہ زخم کھا کر آرہا ہوں

وہ شاید ڈوبنے سے بچ بھی جاتا
سہارا اس کو تنکے کا بہت تھا

شاعری مختصر نویسی ہے
ورنہ لاوا تھا دل میں لا محدود

چاہے جتنا بھی ہو وسیع نگر
پھر بھی ہوتا ہے دائرہ محدود

اکیلے پن میں اپنی خود کلامی
تجھی سے گفتگو ہے اور کیا ہے؟

خود کو ایسی کڑی سزا دوں گا
تم سے اک لفظ بھی نہ بولوں گا

عصرِ حاضر کی بدلتی ہوئی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتحال کا ادراک ایک حقیقت پسند فنکار کا طرۂ امتیاز ہے کہ فن اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ عہدِ موجود کی سنگین حقیقت نگاری ہماری شاعری کا ایک اہم باب ہے اور غزل اس اظہار میں کسی سے کم نہیں بلکہ جدید غزل میں اس کا حصہ کہیں وافر ہے۔ اقبال فرید بھی ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔ وہ بھلا اس احساس و فکر کے اظہار و ابلاغ سے

کس طرح دوررہ سکتے ہیں؟ان کاایک شعر ہے۔

کچھ تو عکاسیِ ماحول غزل میں ہو فرید
وقت کی لے نہ ہو جس میں وہ سنایا نہ کرو

لیجئے ان کی غزل میں وقت کی لے پر عکاسیِ ماحول کے نغمے ملاحظہ کیجئے۔

گلوں کو کب میسر تھی یہ سرخی
ہمارا ہی لہو ہے اور کیا ہے؟

جو بھی کرنا ہے آج ہی کرلو
وقت ٹھہرا ہے کب کہاں لوگو!

چھین لو ہاتھ سے ساقی کے جب انصاف نہ ہو
رند کہلاؤ تو کچھ جرأت رندانہ کرو

چڑھتے سورج کو پوجنے والو!
کیا کرو گے جو ڈھل گیا سورج

کتنے چہروں سے نقابیں اٹھ گئیں
راہزن کے روپ میں رہبر کھلے

ماں کے سر سے اتر گئی چادر
بھوکے بچوں کا پیار ایسا تھا

کیا پتا کل بھی یہ لمحات ہمارے ہوں گے
آؤ کچھ دیر ذرا بیٹھ کے ہنس لیں رولیں

لگایا پیڑ کس نے چھاؤں کس کی؟
عجب یہ باغبانی ہو گئی ہے

تم اپنے آپ کو نیلام گھر میں کیوں لائے؟
یہاں تو ہوگی ہی ہر جنس پر خرید کی بات

یہی حقیقت پسندی فنکار کی شخصیت میں جب رچاؤ پیدا کرتی ہے تو اس کی حیثیت اتنی گہری اور سوچ اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ وہ انسانیت کا علمبردار بن کر سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں محسوس کرتا ہے۔وہ انسانی اخلاق اور کردار کی تہذیب وتطہیر کا فریضہ یوں انجام دیتا دکھائی دیتا ہے کہ اس کی بات بات میں ایک دردمندانہ آفاقی نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی پوری شخصیت کا منشور اور پیغام بن جاتا ہے۔

طبیعت جھوٹ کہنے پر کبھی مائل نہیں لیکن
مرے سچ سے کوئی پائے ضرر اچھا نہیں لگتا

بانٹ دو دوستوں میں سب خوشیاں
درد اپنے جگر میں رہنے دو

اقبال فرید کی زبان ان کی فکر کی طرح شائستہ سادہ اور رواں ہے۔وہ ایک تفکر پسند شاعر ہیں۔ان کے یہاں فکر کی گہرائی بھی ہے اور خیال کی بلندی بھی۔زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نظر مثبت اور تعمیری ہے جسے انہوں نے مسلسل مشق وریاضت ،طویل تجربے اور مطالعے سے اپنایا ہے۔کہتے ہیں شخصیت پر نام کا بہت اثر پڑتا ہے۔اقبال فرید کے نام میں ہماری تاریخ کی دو بڑی شخصیات یکجا ہیں۔اقبالؒ اور فریدؒ۔اقبال شعر وحکمت کے شہسوار اور فرید تفکر و معرفت کے تاجدار ہیں۔اقبال فرید کے فن اور شخصیت پر بھی یہ صفات پوری طرح سایہ فگن ہیں۔اور آج وہ ایک صاحب اقبال اور فرید شاعر کے طور پر اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔

''حُسن آوارگی'' کا شاعر.....جاوید اختر جاوید

جاوید اختر جاوید کا نام سعودی عرب کی ان چند محفل آرا شخصیتوں میں ہوتا ہے جو یارانِ وطن کی ادبی' تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا محور و مرکز ہیں۔ وہ دل میں قوم و ملت کا حقیقی درد رکھنے والے سچے پاکستانی ہیں۔ ناظم کے طور پر محفلوں میں اپنی ذات سے ایک طرح کی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ دوسروں کی عزت افزائی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ انہیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔ اپنی دھن میں وہ مست رہتے ہیں۔ مشاعرے میں انہیں کہیں بھی پڑھوا دیا جائے۔ یہ ان کا مسئلہ نہیں۔ کہ وہ کسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں۔ اصل میں وہ اس حقیقت کے قائل ہیں کہ شاعر کا سب سے بڑا تعارف اس کا کلام ہوتا ہے۔ اگر اس کے کلام میں جان نہیں تو ہزار بیساکھیاں بھی اسے قد آور نہیں بنا سکتیں۔ اور اگر اس کی شاعری میں زور ہے تو وہ دور سے سامعین کی توجہ اپنی جانب کھینچ لے گی۔

جہاں سیاست میں علامہ مشرقی' خطابت میں عطاء اللہ شاہ بخاری اور صحافت میں آغا شورش ان کے آئیڈل ہیں۔ وہاں شاعری میں وہ اختر شیرانی' عدم' فیض' ساحر اور جالب سے متاثر ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کی مصلحت سے ماورا وہ ایک ایسے حق گو اور بیباک اہل قلم ہیں جن کے یہاں رومان بھی ہے اور انقلاب بھی۔ نظم اور غزل دونوں شاہراہوں پر وہ یکساں گامزن ہیں۔ ان کی نظم اگر مزاحمتی رویئے کی عکاس ہے تو غزل رومان کی خوشبو سے معطر محسوس ہوتی ہے۔ ان کا مجموعہ سخن ''حسنِ آوارگی' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

معاشرے میں منفی سماجی' سیاسی اور معاشی صورتحال کے خلاف احتجاج مزاحمت کا روپ دھارتا ہے اور یہی مزاحمت شدید ہو کر انقلابی رویوں کو جنم دیتی ہے۔ ہمارے یہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی صورت میں سامراج دشمنی ہو کہ جاگیردارانہ طبقاتی نظام کی مخالفت' ہر عہد میں

سماج کا حساس طبقہ مزاحمت کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔ اور ادب کے محاذ پر اس فرض کو نبھاتے ہوئے ہمارے اربابِ فکر و فن نے ہمیشہ عوام کی ذہنی رہنمائی کی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر' اکبر الہ آبادی اور حسرت موہانی اپنے اپنے دور میں اس قافلے کے سرخیل رہے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی مزاحمت کی یہ تحریک جاری رہی اور اس سلسلے میں علی سردار جعفری' ساحر' فیض اور جالب کے نام نمایاں ہیں۔ جاوید اختر جاوید بھی اسی قافلے کے رہرو ہیں۔

ایک سچے فنکار کی طرح عہد رواں کے مسائل ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ چنانچہ ان کی چند نظموں کے عنوانات دیکھ کر ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کشمیر و بوسنیا' فلسطین' کشمیری حریت پسندوں کے نام' جنگ' انقلابی گیت' بابری مسجد کے نام' پاکستان کے لئے امریکی امداد کی بندش پر' انتخاب اور زلزلہ وغیرہ۔ شاعر ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف ہے۔ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ وہ حریتِ فکر اور آزادیٔ انساں کا قائل ہے۔ اسی لئے کشمیر ہو بوسنیا ہو یا فلسطین' جہاں بھی آوازِ حق کو دبایا جائے اس کا لہجہ احتجاجی ہو جاتا ہے۔ وہ آگ اور خون کے اس بپھرے طوفان پر سوئے ہوئے ضمیر عالم کو جھنجھوڑتا ہے۔

اس نئے ظلم پر اس نئے جبر پر کچھ تو بولو ذرا' لب کو کھولو ذرا
تا کہ ہو یہ یقیں' اب بھی زندہ ہو تم

اسی طرح ''کشمیری حریت پسندوں کے نام'' نظم میں انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تجلیوں کے خریدار زاہدوں کی طرح
حیات و موت سے گزرو مجاہدوں کی طرح

وہ جنگ کے خلاف امن کا پیامی ہے چنانچہ کہہ اٹھتا ہے۔

جنگ سے دور رہنا بہتر ہے
جنگ اک آگ کا سمندر ہے

شاعر سماج کے نا روا بندھنوں کا باغی ایک انقلابی ہے اور اسے خوشامد اور ریا کاری سے نفرت ہے۔ چنانچہ ''انقلابی گیت'' میں اس کا انداز کچھ یوں ہے۔

میں باغی ہوں جو سماجوں کا سبھی رسموں اور رواجوں کا
میں باغی شاہوں تاجوں کا میں باغی جھوٹے راجوں کا

میں ناکامی ہوں خاصوں کی عوامی کامیابی ہوں
مجھے نفرت خوشامد سے میں ایسا انقلابی ہوں

''بابری مسجد کے نام'' اور ''پاکستان کیلئے امریکی امداد کی بندش پر'' ایسی نظمیں ہیں جن میں قومی اور ملی غیرت وحمیت کو بیدار کیا گیا ہے۔ اور ''زلزلہ''۔ ''انتخابات'' ''آؤ عہد کریں''۔ ''ایک خط پھر وطن سے آیا ہے'' اور ''نذر وطن'' جیسی نظموں میں اپنی مٹی سے گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ اس مٹی کا دکھ بھی محسوس کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''نذر اقبال'' اور ''نذر قائد اعظم'' میں ان مشاہیر سے جہاں اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔ وہاں آج کے تناظر میں وطن عزیز کی المناک تصویر بھی اجاگر کی گئی ہے۔ وہ ایک محبِ وطن شاعر ہیں اور کتاب کے پس ورق پر یہ شعر اس کا زندہ ثبوت ہے۔

پاکستان کے رکھوالے ہم یہ پہچان ہماری ہے
ذرہ ذرہ اس کا کندن' مٹی جان ہماری ہے

اپنے قطعات میں بھی انہوں نے عہد حاضر کے مسائل ومباحث کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً منافقت اور جھوٹ کی بجائے وہ اپنے اہل قلم ساتھیوں کو سچ کی ترغیب دیتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں۔

سجا ہے جھوٹ کا بازار آؤ سچ لکھیں
میں کہہ رہا ہوں سردار آؤ سچ لکھیں
ہیں اک قلم کی سیاہی سے ظلمتیں لرزاں
قلم کی نوک ہے تلوار آؤ سچ لکھیں

ان نظموں میں شاعر سادہ اور پر اثر لفظوں میں اپنے دل کا گداز کچھ اس اسلوب سے بیان کرتا ہے۔ کہ ان میں لمحہ موجود کا تمام درد اور روح عصر کا سارا کرب نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی حمدوں نعتوں اور دعا میں بھی اس کا یہ پر سوز لہجہ اسی طرح قائم ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جاوید شاعری میں اختر شیرانی' عدم' ساحر' فیض اور جالب سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہیں۔ تلاش کرنے پر یہ اثر آسانی سے ہمیں ان کی شاعری خاص طور پر غزل میں مل جاتا ہے۔ مثلاً شاعرِ رومان اختر شیرانی کے زیر اثر یہ شعر دیکھئے۔

کیوں نہ سوچیں اسے کیوں نہ چاہیں اسے
خوبرو' دلربا' دن نشیں گلبدن

اے لالہ فام! حسین ترا لازوال ہے
جس کا نہ ہو جواب تو ایسا سوال ہے

اور اسی طرح عدم کا پرتو کچھ یوں نظر آتا ہے۔

میں پی رہا ہوں لذتِ رنج ومحن کے ساتھ
ہر جام نذر شام کئے جا رہا ہوں میں

میں تو پیتا ہوں اس کی آنکھوں سے
ہاتھ میں گو گلاس رہتا ہے

دولت غم جنہیں میسر ہو
وہ بھلا کب غریب ہوتے ہیں

خود سے جو باخبر نہیں ہوتا
وہ کبھی معتبر نہیں ہوتا

ساحر کا اثر ان اشعار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

کبھی ستم کی سیاہ شب کو خوشی بھری صبح لکھ نہ پایا
میں کیسے ظلمت کدوں کو جاوید تابشِ آفتاب لکھوں؟

جرم و نفرت کی یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے
یہی عالم ہے تو دنیا نہ بسائے کوئی

ہر سو ہنگامہ ہے برپا آگ سی دل میں روشن ہے
ہر دم شعلوں میں رہتا ہوں تم سے کیسے پیار کروں؟

فیض نے دورِ حاضر کے تقریباً سبھی نوجوان شعرا کو اپنے دل نشیں اندازِ سخن سے متاثر کیا ہے۔ جاوید کے یہاں بھی یہ اثر ملتا ہے۔ مثلاً

اندھیرا پھیل گیا ہے شجر شجر ہے اداس
صبا کا ذکر کرو اور سحر کی بات کرو

یہ تری شہر پنہ ہے کہ کوئی مقتل ہے
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

اور اب دیکھئے جالب کا انقلابی اور عوامی لہجہ ان کی غزل میں کیسے ظاہر ہوتا ہے۔

لاشے پڑے ہیں راہ میں تقدیسِ ذات کے
رسوا ہے آج خلق خدا میرے دیس میں

سلطان وقت سے مرا جاوید ہے سوال
چھائی ہے کیوں غموں کی گھٹا میرے دیس میں

خود ان کی کتاب کا نام ''حسن آوارگی'' جالب کے اس شعر سے مستعار ہے

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

لیکن سینئر شعرا کے یہ اثرات کہیں بھی لفظوں کی نقالی نہیں بنتے بلکہ پہلے سے موجود روشن چراغوں کی لو سے یہاں، فکر و نظر کے نئے چراغ جلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کاوش میں جاوید کا اپنا لب و لہجہ نکھر کر نمایاں ہوتا ہے۔ جو نفرت تعصب اور منافقت سے کوسوں دور محبت صداقت اور خلوص سے عبارت ہے۔ ان کے یہاں زلف و رخسار کے ساتھ ساتھ رسن و دار کے گیت بھی گائے گئے ہیں۔ شباب ہے تو انقلاب بھی ہے اور سب سے بڑھ کر اس دور پر آشوب میں امن و آشتی سے لبریز آزادیٔ بشر کا آفاقی پیغام ہے۔ گویا ان کے یہاں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی۔ دوسرے لفظوں میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ لیکن اس تمام احساس اور فکر میں خود احتسابی کا عمل بھی شامل ہے اور یہی ان کا نظریۂ فن ہے۔ آیئے ان کی غزل سے شعروں کا ایک مختصر انتخاب دیکھیں۔

صبح مجھے پہچانتی ہے
آخر شب کا تارا ہوں

حریم دل میں یہی آرزو مچلتی ہے
دیار غیر میں کوئی تو آشنا دیکھوں

سارے رشتے تھے زمانے کے مری سانس تلک
کوئی رویا نہ مری موت پہ بادل کے سوا

اس دور کے مغرور یزیدوں سے یہ کہہ دو
شبیرؑ کے پیرو ہیں اطاعت نہ کریں گے

جب تری یاد کے گرداب میں کشتی ڈوبی
ہم نے سب کچھ ہے کیا خواہش ساحل کے سوا

اک تم کہ اپنی فکر میں کچھ دیکھتے نہیں
اک ہم کہ ہم کو ساری خدائی کی فکر ہے

منزلِ شوق کی طلب ہی نہیں
کیا ہوا میرے رہنماؤں کو؟

شاعر کا خواب بن کے غزل میں سما گیا
اے پیکر جمال! تو دلکش خیال ہے

پہلے تسلیم کرو وقت کا سقراط مجھے
پھر مجھے پیش کوئی زہر کا پیالہ کرنا

سب کھڑے ہیں باادب نظریں جھکائے روبرو
تاج کس سر پہ رکھا ہے دیکھتا کوئی نہیں

تم اپنے پیار سے روشن کرو نئی صبحیں
کدورتوں کو ہٹاؤ تو روشنی ہے بہت

پیار کے دیپ جلاؤ تو غزل ہوتی ہے
دل میں کچھ درد جگاؤ تو غزل ہوتی ہے

جو اٹھے سر بلند ہوتا ہے
وہ جو جھک جائے سر نہیں ہوتا

اور

حسنِ آوارگی ہوں میں جاوید
پھر ہوا نے مجھے پکارا ہے

ہوا کی اس پکار پر ہی شاعر نے بیساختہ آوارگی کا سفر اختیار کیا ہے اور اب وہ ہوا کے دوش پہ بکھرتے پتوں کی طرح فضا میں ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ دراصل آوارگی اس کیفیت کا نام ہے جس میں مسافر کسی منزل کا تعین کئے بغیر سفر کرتا ہے مگر یہ بے مقصدی بھی درحقیقت ایک مقصد ہے کہ اس سیر میں دل ونظر کے دریچے کھلتے ہیں اور مسافر زیادہ روشنی سے مستفید ہوتا ہے۔ جاوید اختر جاوید کے یہاں یہ آوارگی ''حسن آوارگی'' بن کر سامنے آتی ہے جس میں گردِ راہ کی مہک بھی ہے اور سنگ میل کی خیرہ کن چمک بھی۔ محوِ پرواز ہم صفیروں کی چہک بھی ہے اور منزل کے رنگوں کی دلفریب دھنک بھی۔ اور رنگ، خوشبو، روشنی اور آواز کی اس ترتیب کا نام ہی زندگی ہے۔

ریحان اظہر.....ایک کامیاب ناول نگار

ریحان اظہر کو میں پاکستان سے جانتا ہوں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر اسے ایک کامیاب اداکار کے طور پر دیکھا۔ پھر اس کے افسانوں کا مجموعہ ''کھوکھلے لوگ'' اور شعری مجموعہ ''جانم'' نظر سے گزرے۔ سعودی عرب آ کر معلوم ہوا کہ اس کا ایک سفرنامہ ''ہائے امریکا بائے امریکا'' اور انگریزی شاعری ''مائی ہارٹ بیٹ'' بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور اب اس کا ناول شائع ہوا ہے ''رابعہ زندہ ہے'' براڈکاسٹر، ٹی وی اداکار، افسانہ طراز، شاعر، سفرنامہ نویس اور اب ناول نگار۔ یہ اس کی فنکارانہ شخصیت کے مختلف روپ ہیں جن سے ظاہر ہے کہ وہ ایک زبردست فنی اور تخلیقی قوت کا مالک ہے۔

ناول ہمارے یہاں بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ اب بھی نثری ادب کی سب سے بڑی، سب سے جامع اور سب سے مشکل صنف ہے۔ اور اس کے فنی تقاضوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا ہر ادیب کے بس کی بات نہیں۔ اکثر قلمکار اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ریحان اظہر کی ہمت قابل داد ہے کہ اس نے اس طرف توجہ دی ہے۔

کسی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قاری اس میں کشش محسوس کرے اور افسانوی ادب میں تو یہ خوب اور بھی ضروری ہے کہ اس میں پڑھنے والے کی دلچسپی کا وافر سامان کہانی کی صورت میں مہیا ہوتا ہے۔ اس ناول میں یہ خوبی پوری طرح موجود ہے کہ خود میں نے شروع سے اخر تک اس کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ اور یوں مصنف کا یہ دعویٰ بالکل درست ثابت ہوتا ہے کہ ''پڑھنے والے جب اسے پڑھنا شروع کریں گے تو ان کا جی چاہے گا کہ وہ اب اسے ختم کر کے ہی اٹھیں''۔ میں نے بھی اسے بغیر کسی وقفے کے ایک ہی نشست میں پڑھا ہے۔ اور یہ اس میں موجود اس دلچسپی کے باعث ہے۔ جو کہانی کا تانا بانا بنتے ہوئے مصنف نے اس میں قائم رکھی ہے۔

ناول جیل کی کال کوٹھری میں فلیش بیک انداز میں شروع ہوتا ہے۔ اور اس کی مختصر کہانی کچھ یوں ہے کہ ناول کے مرکزی کردار رابعہ کے والد منور اندرون شہر کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شادی کے بعد بھی رابعہ کی دادی اور چچا کے ہاتھوں میں کھیلتے تھے اور اس کی والدہ صغراں سے کھچے کھچے رہتے تھے اور لندن جانے کے بعد یہ دوری اور بڑھتی گئی۔ کچھ عرصے بعد دادی اور چچا بھی ان سے الگ رہنے لگے۔ اور یوں رابعہ اس کے چھوٹے بہن بھائی سعدیہ اور سلیم اپنی والدہ کے ساتھ رہ گئے۔ چچا کی شادی کے بعد دادی بھی ان کے ساتھ لندن چلی گئی اور اب رابعہ اس کی والدہ اور چھوٹے بھائی بہن کرائے کے مکان میں گلبرگ رہنے لگے۔ رابعہ کی والدہ شوہر کی مسلسل بے رخی کے ردعمل میں راہ راست سے بھٹک گئیں اور انہوں نے ایک عیاش بینک منیجر بابر سے ناجائز تعلقات استوار کر لئے۔ ادھر سعدیہ اور سلیم کو ان کے ڈیڈی نے اپنے پاس لندن بلوا لیا۔ رابعہ کی والدہ خاوند کے رویے سے پریشان تھیں۔ انہوں نے اپنی ساس اور دیور سے اپنے خاوند کا پیچھا چھڑانے کے لئے ایک جعلی عامل ملنگ پیر بابا کا سہارا لیا۔ اور اس لالچ میں اپنی عزت بھی گنوا بیٹھیں۔ ادھر رابعہ کو بے سہارا دیکھ کر کالج میں اس کی سہیلی کال گرل یاسمین نے غلط راستے پر چلانے کی کوشش کی۔ اور اسی اثناء میں وہ جاوید نامی ایک عیاش امیر زادے کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گئی۔ رابعہ کی امی ذہنی مریض ہو کر مینٹل ہسپتال میں داخل ہو گئیں اور کچھ عرصے بعد لاپتہ ہو گئیں۔ ہسپتال کے ایک نوجوان فرشتہ سیرت ڈاکٹر رحیم سے رابعہ کی شادی ہو گئی اور وہ دو جڑواں بچیوں کی ماں بن گئی۔ ایک دن ڈاکٹر رحیم کا ایک دیرینہ دوست اس سے ملنے گھر آیا۔ وہ جاوید تھا۔ اسے دیکھ کر رابعہ کے اندر سویا ہوا انتقام جاگ اٹھا اور اس نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ رابعہ کو عمر قید ہو گئی اور یوں وہ جیل میں آ گئی۔ اپنی سزا کاٹ کر جب ایک دن وہ رہا ہوئی تو جیل کے دروازے پر ڈاکٹر رحیم اور اس کی دونوں بچیوں نے اس کا استقبال کیا۔ اور اسے واپس گھر لے آئے۔ بچیوں کی شادی کے بعد رابعہ اور ڈاکٹر رحیم حج کرنے چلے گئے۔ واپس آ کر ایک دن وہ ایک مزار پر فاتحہ کے لئے گئے تو وہاں رابعہ کی ماں ایک ملنگنی کے روپ میں ملی۔ جو اپنی بیٹی کو دیکھتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اس ناول کے مرکزی کردار رابعہ کے اردگرد مختلف کردار ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی، فرشتے بھی اور شیطان بھی۔ عبدل چاچا اور ڈاکٹر رحیم جیسے نیک اور رحمدل انسان بھی اور بینک منیجر

بابر اور امیر زادے جاوید جیسے ہوس پرست اور عیاش شیطان بھی' کال گرل یاسمین جیسی گم راہ لڑکی بھی اور ملنگ بابا جیسے مکار اور عیار بھی' اس کا سادہ لوح والد منور بھی اور اس کی عاقبت نا اندیش والدہ صغراں بھی۔ مصنف نے ان کرداروں کو کہانی کی سکرین پر اس چابکدستی اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے کہ یہ سب ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ ریحان اظہر کی زبان میں سادگی اور سلاست ہے اور اس کے بیان میں روانی اور تسلسل ہے۔ اس طرح کہ پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن کو کہیں جھٹکا محسوس نہیں ہوتا اور وہ کہانی کے مختلف مناظر میں یکساں دلچسپی کے ساتھ رواں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول کی ایک اور خصوصیت اس کا اختصار ہے۔ عام طور پر منظر نگاری میں تفصیل اور توضیح کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن ریحان کی منظر نگاری میں بھی اختصار اور ایجاز کا پہلو ہے۔

عموماً ناول ایک مخصوص نقطۂ نظر سے ایک مرکزی کردار کی زندگی کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ اس ناول میں بھی مرکزی کردار رابعہ کی زندگی کو مصنف کے خاص نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب اس لحاظ سے مصنف کے نظریۂ فن کی کلید ہے۔ اس انتساب کی پہلی دو سطریں یوں ہیں۔ ''میں اپنا پہلا ناول اپنے بگڑتے ہوئے معاشرے سے منسوب کرتا ہوں۔ جس کی اصلاح اور تربیت کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے''۔ گویا یہ ناول ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی کہانی ہے۔ جس میں بنیادی طور پر عورتوں کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کا اظہار ہے۔ اس میں عورت کی عظمت و رفعت اور پستی و ذلت دونوں کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ عورت اگر چاہے تو صبر' ایثار اور وفا کے سدا بہار پھولوں سے اپنے گھر کو جنت بنا سکتی ہے اور یہی عورت جب بے صبری' خود غرضی اور بے وفائی کا پیکر بن جائے تو گھر کو دوزخ سے زیادہ بھیانک روپ دے سکتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی موضوع عورت ہے۔ جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ جو بہشت کی خوشبو ہے' خدا کی بہترین نعمت ہے اور جس کے وجود سے تصویر کائنات میں زندگی کے رنگ ابھرتے ہیں۔ رابعہ بھی ایسا ہی زندہ کردار ہے۔ جو ایک خوبصورت مشرقی عورت ہے' باہمت اور باوفا' وہ حالات کے سامنے سپر انداز ہونے کی بجائے ان کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتی ہے اور بالآخر کامیاب و بامراد ٹھہرتی ہے۔ وہ جاوید کی شکل میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی برائیوں کو قتل کر دیتی ہے اور خود زندہ رہتی ہے کہ نیکی اور اچھائی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

سعید قیس کی شاعری

سعید قیس کا شمار ان چند شعرا میں ہوتا ہے جو عرصۂ دراز سے وطن عزیز سے دور دیار غیر میں اپنے خون جگر سے چراغ سخن روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہ بحرین میں مقیم ہیں اور وہاں شعر و ادب کی دنیا کی ایک معتبر اور مؤقر شخصیت ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعی شائع ہو چکے ہیں۔ ''حدیث غم'' ''ہجر کے موسم'' ''در و دیوار'' اور ''محبت روشنی ہے''۔ اردو کے علاوہ کبھی کبھی پنجابی زبان میں بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ مگر ان کا اصل میدان اردو شاعری ہے۔ اگرچہ انہوں نے قطعہ اور ہائیکو بھی لکھے ہیں۔ لیکن غزل ان کا امتیاز خاص ہے۔ وہ تقریباً پچاس برس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ یوں وہ ہمارے سینئر شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ طویل مشقِ سخن اور مسلسل ریاضتِ فن نے ان کی شاعری کو جہاں اظہار و بیان کی پختگی بخشی ہے وہاں لفظ و معنی کا ایک نکھار بھی عطا کیا ہے۔

ان کی غزل پر ہماری کلاسیکی روایت کا اثر بھی ہے اور جدید طرز بیاں کا پرتو بھی۔ اس لحاظ سے وہ قدیم و جدید کا ایک خوبصورت اور خوشگوار امتزاج نظر آتی ہے۔ سادگی' روانی اور بیساختگی ان کی غزل کے اہم فنی اجزا ہیں۔ اور پھر مختصر بحر میں سہل ممتنع کا سا انداز انہی کا حصہ ہے۔

یہ چند شعر دیکھئے۔

ہم ہی تنہا رہ گئے ان کے بغیر
اور دنیا میں کسی کا کیا گیا؟

سب کا سونا تول چکے ہو
اپنی مٹی کب تولو گے؟

ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن
ہماری آرزو کتنی بڑی ہے

تھوڑا تھوڑا تم جیسا ہے
چاند مجھے اچھا لگتا ہے

دل پتھر کا گھر ہے، جس میں
شیشے کا سامان بہت ہے

آئنے اندھے اٹھا کر لے گئے
آنکھ والے بے خبر بیٹھے رہے

ہم دل دوستاں میں رہتے ہیں
تم تو اپنے مکان میں بھی نہیں

ان شعروں میں آپ نے دیکھا کہ جہان بیان کی سادگی اور زبان کی روانی ہے۔ وہاں فکر کی جودت اور خیال کی جولانی بھی ہے۔ شاعر بات چیت کے انداز میں نہایت اختصار اور ایجاز کے ساتھ دل کی بات کہنے کا ایسا دھیما دھیما لیکن پر اثر اسلوب جانتا ہے کہ بات تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ یہی اثر آفرینی ان کی پہچان ہے۔

قیس کی غزل کا عمومی مزاج یاسیت پر مبنی ہے۔ رنج و غم کی ہلکی ہلکی مسلسل آنچ جو پتھروں کو بھی پگھلا کے رکھ دیتی ہے۔ ان کے لہجے میں یوں گھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ ان کا پورا وجود دکھ کے الاؤ

میں جل کر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔

زخم کھایا ہے تو روتے کیوں نہیں؟
پاؤں میں چبھتی نہیں زنجیر کیا.....؟
سب کی ہتھیلیوں پہ دئے تھے شب فراق
سب جل رہے تھے اور منور کوئی نہ تھا

وہی اجاڑ محلے وہی اداس کھنڈر
ہم اپنی ذات کے اندر سفر بھی کر آئے

بادل مری زمین سے ہو کر گزر گئے
دریا بھی مجھ کو دیکھ کے رستہ بدل گیا

ہم بیاباں اپنی تنہائی کا تھے
دل میں جنگل تھا تو گھر کیا دیکھتے؟

اس یاس آمیز فضا میں کہیں کہیں آس و امید اور نشاط و کیف کی ایک لہر بھی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ کہ زندگی اسی لہر کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً

کوئی آتا نہیں دروازے پہ دستک دینے
اس طرف سے بھی گزر جائے ہوا سے کہنا

وہ جس کے قرب سے حرف وصال روشن ہے
مرے چراغ جلائے ہوئے اسی کے ہیں
آج دریچے سے جب اس نے باہر جھانک کے دیکھا

اک دروازہ میرے دل کے اندر آن کھلا تھا

ہم اپنے شوق میں ڈوبے ہوئے ہیں
ہمارے شہر میں دریا کہاں ہے؟

میں صحرا ہوں مگر پیاسا نہیں ہوں
مرے پہلو میں اک دریا ہے میرا

یہی زندگی آمیز کیفیت قیس کی ایک معروف اور مقبول غزل کے اکثر اشعار میں بھی ملتی ہے جس کا مطلع ہے۔

دل کو سیراب کیا اور نہ پیاسا رکھا
ہم نے دریا سے عجب جبر کا رشتہ رکھا

اور اسی غزل کے یہ اشعار دیکھئے۔

تیری سانسوں کی مہک آئے جہاں سے آئے
ہم نے دیوار میں ہر سمت دریچہ رکھا

یہ بجا دودھ کی نہریں نہ بہائیں ہم نے
یہ کہو ہاتھ سے کب ہم نے یہ تیشہ رکھا

روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اس نے دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

جب تک کسی فن پارے میں فنکار کے خون جگر کی آمیزش نہ ہو۔ وہ شہکار نہیں بن سکتا۔ ہنر کا یہ اخلاص سعید قیس کے نظریۂ فن کی بھی اساس ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

قیس جگر کا خون بھی شامل کر لینا شعروں میں

کشتِ غزل میں رنگ برنگے پھول کھلا کے لکھنا

اور

زخم ترتیب سے رکھ دینا غزل ہے اے قیس
شعر کہنا تو ہے بس خون اگلتے رہنا

یہ خون اگلتے رہنا ہی تخلیق فن کی دلیل ہے۔ کہ اس خون میں دل کی کسک بھی شامل ہوتی ہے اور جگر کی دہک بھی۔ فکر کی حدت بھی ہے اور احساس کی شدت بھی۔

قیس ایک کہنہ مشق پُر گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ چنانچہ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی وہ مختلف لسانی تجربات میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل میں انہوں نے تابع مہمل کا کیا خوب استعمال کیا ہے۔ دیکھئے۔

ایک نمی سی انکھوں میں ہے جھرنا ورنا کیا ہے؟
سوچ رہے ہیں ان زخموں نے بھرنا ورنا کیا ہے؟

اور

بارش کا موسم جب تھا تو سوچا و وچا کب تھا؟
اب دل ول کا برتن ورتن بھرنا ورنا کیا ہے؟

اسی طرح ایک متروک لفظ نہیں کے استعمال میں بھی انہوں نے چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً

غزل کہنی ہے پر جی چاہتا نہیں
یہ مشکل کام میرے کام کا نہیں

اور

آنکھ میں کاجل ہوتا نہیں
اب میں پاگل ہوتا نہیں

ردیفوں کے سلسلے میں بھی انہوں نے ایک جدت اور ندرت کو ملحوظ رکھا ہے۔خاص طور پر وہ ردیفیں جن کا ایک روحانی پس منظر ہے۔مثلاً بابا' سائیں' سائیں بابا' مولا اور اللہ میاں۔

قیس اگرچہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔لیکن انہوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔مثلاً حمد' نعت' قطعات اور ہائیکو وغیرہ۔یہاں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔حمد و نعت میں ان کا جذبۂ ایمان و ایقان اور عقیدت و ارادت کا خلوص صاف نظر آتا ہے۔مثلاً حمد کے یہ اشعار دیکھئے۔

میرے شعروں کا بھرم تیرا ہے
ہاتھ میرے ہیں قلم تیرا ہے

اور

روشنی چاند نہ لائے تو وہی غیب کا ہاتھ
شب تاریک میں جگنو کو دیا بھیجتا ہے

اسی طرح نعت کا انداز ملاحظہ کریں۔

احساس جاں میں لذتِ ادراک و آگہی
خواب گراں میں حرفِ بشارت رسول پاکؐ

اور

سوچتا ہوں تو بہت دور ہے منزل میری
دیکھتا ہوں تو مدینہ ہے مرے سینے میں

ان کے قطعات میں چار سو پھیلی ہوئی زندگی کے مشاہدات کا نچوڑ ہے۔گویا انہوں نے کوزے میں سمندر بند کرنے کی سعی کی ہے۔مثلاً

حادثہ تھا گزر گیا کب کا
ایک دل تھا سو مر گیا کب کا
جس کو عہدِ شباب کہتے ہیں
وہ سمندر اتر گیا کب کا

اور

زندگی بے شمار لوگوں کو
بستیوں میں اتار دیتی ہے
اپنی مرضی سے یہ نہیں مرتے
مصلحت ان کو مار دیتی ہے

اور آخر میں ہائیکو کے دو نمونے دیکھئے۔

لوگ سوالی ہیں
کچھ خیرات ملے سائیں
جیبیں خالی ہیں

بیکل ہوتے ہو
ہجر تو ہم نے کاٹا ہے
تم کیوں روتے ہو؟

غرض سعید قیس کی شاعری زندگی کے رنگا رنگ تجربات کا بیان ہے۔جس کے پیرایۂ اظہار میں غم جاناں کا سوز بھی ہے اور غم دوراں کا گداز بھی۔اس میں حدیثِ غم کی خلش بھی ہے اور ہجر کے موسم کی تپش بھی' خواب در و دیوار بھی ہے اور محبت کی روشنی کا نکھار بھی۔ان کے وسیع مشاہدے اور عمیق مطالعے نے اس بیان میں وسعت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔اور یوں ان کی آواز اپنے عصر کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیتی نظر آتی ہے۔ہمارے عہد میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے ایسی شاعری بلاشبہ ایک قیمتی سرمایہ اور قابل قدر اثاثہ ہے۔

سہیل ثاقب.....آشنائے رہ ورسمِ منزل

زندگی نام ہے سفر کا' کہ انسان پہلی سانس سے لے کر آخری سانس تک مصروف سفر رہتا ہے۔وہ اپنی پہلی منزل یعنی گہوارے ہی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔کہ لحد کی آخری منزل تک آتے آتے کسی نہ کسی طرح حرکت پذیر ہی رہتا ہے۔کہ زندگی حرکت ہی سے عبارت ہے۔اس کا یہ سفر تلاشِ معاش کے سلسلے میں ہو کہ جستجوئے جاناں کے لئے' وہ کبھی تنِ تنہا اور کبھی دوسروں کے ہمراہ مشغول سفر رہتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ سفر کو جہاں سقر یعنی دوزخ کی طرح تکلیف دہ کہا جاتا ہے' وہاں اسے وسیلۂ ظفر بھی مانا گیا ہے۔بہر حال سفر سفر ہے' چاہے دیس میں ہو یا پردیس میں۔اور پھر گھر سے بے گھر ہو کر وطن سے غربت کی جانب ہجرتوں کے سفر کی اپنی معنویت ہے کہ اس سفر میں جہاں انسان اپنی ذات کے اندر سیر کرتا ہے' وہاں کائنات کی وسعتوں سے بھی آشنا ہونے کا اسے موقع ملتا ہے۔

سہیل ثاقب بھی ایک ایسا مسافر ہے جو ایک عرصے سے محوِ سفر ہے۔کہ اس نے اسی عالم میں زندگی کے معانی اور مفاہیم پانے کی کوشش کی ہے۔وہ ایک ایسا راہرو ہے جو رہ ورسم منزل سے مکمل آشنا اور آدابِ سفر سے پوری طرح واقف ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں سفر زندگی کا بھرپور استعارہ اور فن کا کلیدی نکتہ قرار پاتا ہے۔اور یہی اس کا رختِ سفر بھی ہے۔آیئے اس کے یہاں اس سفر کے مختلف مراحل کی سیر کرتے ہوئے اس کے فن کے کلیدی نکتے یعنی اس کے زادِ سفر کو دریافت کریں۔اس کے لئے ہمیں اس کی غزل سے مدد لینا ہوگی۔جو ایک طرح سے اس کی ذات کا سفرنامہ ہی ہے۔

ہر مسافر منزل کی جستجو میں جب سفر پر نکلتا ہے۔تو اجنبی راستوں کو طے کرنے کیلئے اسے کسی رہبر ورہنما کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔مگر ثاقب عجیب مسافر ہے کہ وہ راستے کی تکالیف کی بجائے

اپنے رہنما سے خوف کھاتا ہے۔کیونکہ اس کا تجربہ یہی ہے کہ رہنما اکثر اہلِ کارواں کو فریب ہی دیتے ہیں۔

سفر پہ نکلا ہوں' منزل کی جستجو ہے' مگر
میں راستے سے نہیں رہنما سے ڈرتا ہوں

گھر سے پردیس روانہ ہوتے وقت مسافر کو الوداع کہنے والی آنکھوں میں اکثر نمی آجاتی ہے۔لیکن یہ نمی اگر کچھ دیر کے لئے کسی محبوب کی آنکھوں میں ٹھہر جائے۔تو مسافر اپنا ارادۂ سفر بھی تبدیل کرسکتا ہے۔

بس ایک شرط پہ اپنا سفر میں روکوں گا
کسی کی آنکھ میں کچھ پل نمی ٹھہر جائے

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے گھری اگر کسی مسافر کا مقدر بن جائے۔تو وہ اسے یوں قریہ قریہ لئے پھرتی ہے۔کہ وہ کبھی لوٹ کے گھر کی طرف نہیں دیکھتا۔

بے گھری جس کو لئے پھرتی ہے قریہ قریہ
وہ کبھی لوٹ کے پھر گھر نہیں دیکھا کرتا

سفر میں منزل کو پالینے کا عزم اور مشکلات سے لڑنے کا حوصلہ ہی مسافر کا اصل زادِ سفر ہے۔جو اسے سیل رواں کی طرح آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

روک سکتا ہی نہیں بڑھنے سے ساحل کی طرف
وہ سمندر ہے تو کیا؟ سیل رواں میں بھی تو ہوں

اور یہی عزم اور حوصلہ مسافر کو اپنی راہیں خود تلاش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اور اس طرح وہ خود اپنا رہبر ورہنما بن جاتا ہے۔

اپنی راہیں خود نکالیں' خود ہوں اپنا رہنما
راستے بھی کیا کبھی راہِ اماں تک لے گئے؟

سفر کے لئے بے پناہ حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔اور مسافر جب ایک مرتبہ منزل کی طرف چل پڑے۔تو پھر یہ نہیں دیکھتا کہ اس تگ و دو کا انجام کیا ہوگا؟

چل پڑے ہو تو حوصلہ رکھو
شام ہو گی کہاں؟ نہیں سوچو

سفر میں ہم سفر اور ہم قدم کی اپنی اہمیت ہے کہ مسافت اس کے سہارے آسانی سے کٹ جاتی ہے لیکن اگر کوئی ہم قدم اچانک اپنی راہ بدل لے تو پھر شکایت کیسی؟

راہ تو بدلی انہوں نے' پھر شکایت ہم سے کیوں؟
ساتھ تھے ہم ہر قدم پر وہ جہاں تک لے گئے

غور سے دیکھا جائے تو ہر شخص اپنی ذات میں تنہا ہے۔ہم سفر اپنی اپنی ذات میں اکیلے رہ کر سفر کررہے ہوں اور دوسروں پر اپنی موجودگی کا اثر نہ ڈالیں۔تو پھر شکوے شکایتوں کا موقع بھی نہیں نکلتا اور سفر بھی اچھا گزر جاتا ہے۔

شاید یہی سبب تھا کہ اچھا کٹا سفر
اک دوسرے کو ہم نے اکیلا سمجھ لیا

دوران سفر تھکے ہارے مسافر کیلئے قافلے کا غبار بھی اکثر فریب نظر کا باعث بنتا ہے۔اور بسا اوقات یہ پتہ نہیں چلتا کہ قافلہ گزر چکا ہے یا ابھی راہوں میں گامزن ہے۔

دھند چھٹ جائے تو پتہ بھی چلے
قافلہ ہے' غبار ہے' کیا ہے؟

یوں یہ غبار بھی رائیگاں نہیں جاتا۔بلکہ مسافر کو ایک نیا حوصلہ عطا کرتا ہے اور اسے اگلی منزلوں کے لئے تیار کرتا ہے۔جو اس کے طویل سفر کا حصہ ہے۔

ثاقب نظر میں رکھتی ہیں اگلی مسافتیں
مت سوچ کیا دیا ہے سفر کے غبار نے

سفر کرتے کرتے مسافر کوچۂ محبوب میں سے بھی گزرتا ہے۔مگر حوصلہ مندی کی اس شان سے ذہن میں خیال یار' پاؤں میں خونچکاں چھالے اور ہونٹوں پر ایک ہنسی ہوتی ہے۔

لہو تھے پاؤں' ہنسی لب پہ اور خیال ترا
تری گلی سے بڑے حوصلے سے گزرا ہوں

ایسے مسافر کا عزم اور حوصلہ بعض اوقات بہتی ہوئی پرشور ندی کو بھی ٹھہرنے پر مجبور کردیتا ہے۔

سبھی اتر گئے کشتی سے ایک میرے سوا
مجھے یہ ضد تھی کہ بہتی ندی ٹھہر جائے

راہرو ایک ایسے پرندے کی طرح ہوتا ہے جسے بلندیٔ منزل تک پہنچنے کے لئے صرف شغل پرواز ہی کافی نہیں۔بلکہ اپنے پروں میں ہمت و حوصلہ بھی چاہئے۔جو پرواز کی اصل طاقت ہے۔کہ اس کے بغیر تمام پر بیکار ہیں۔

صرف پرواز ہی کافی نہیں منزل کے لئے
حوصلے بھی تو بلند اپنے پروں کے ہوتے

ثاقب ایسے مسافر کی ایک اپنی انا ہوتی ہے۔جس کی حفاظت وہ قدم قدم پر کرتا ہے۔اور اگر چلتے چلتے فصیل شہر تک وہ پہنچ بھی جائے۔تو وہ اس کے بند دروازے کھلنے کا انتظار نہیں کرتا۔کہ وہ شہر میں ہر ملاقات سے بے نیاز ہے۔

ہمیں بھی کس سے ملاقات کی تمنا ہے؟
فصیل شہر کا دروازہ وا نہیں نہ سہی

سفر کرتے کرتے کبھی واپسی کا خیال بھی آتا ہے۔لیکن سچا مسافر اور رہرو وہی ہے جو واپسی کے خیال سے بے تعلق ہوکر خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہمیشہ رواں دواں رہے۔

پلٹ کر دیکھتے ہیں یوں سفر میں
کہ جیسے لوٹ کر گھر دیکھتا ہے

کارواں میں شریک تمام رہرو جب منزلوں کے حصول کے لئے اپنی اپنی راہ چل پڑتے ہیں تو وہ آوارگی نصیب مسافر جو اپنی منزل سے بے نیاز ہے۔دشتِ بے اماں میں اپنی ہی خاک اڑانے لگتا ہے۔کہ یہی اس کی آوارگی کا تقاضا ہے۔

اب تو سب نے پا لئے ہیں اپنے اپنے راستے
اے مری آوارگی! اب خاک اڑانے دے مجھے

مگر عجیب بے بسی ہے۔کہ حالات کا جبر اسے ایسی آزادی نہیں دیتا۔اور وہ اکثر اوقات اپنے ہم سفروں ہی کی بدولت نئو منزل کی طرف آگے چل سکتا ہے اور نہ ان سے الگ اپنی راہ بدل سکتا ہے۔

چلنے بھی نہیں دیتے ہیں وہ جانب منزل
رستا بھی مجھے میرا بدلنے نہیں دیتے

اس صورت میں منزل اس کی نظر سے گم ہو جاتی ہے۔اور وہ اسے ڈھونڈنے کے لئے بعض اوقات برابری کی سطح پر آ کر امیر کارواں سے یوں بھی مخاطب ہوتا ہے۔

گم شدہ منزل نہ کیوں ہم ساتھ چل کر ڈھونڈ لیں
اے امیر کارواں! بے کارواں میں بھی تو ہوں

سفر کرتے کرتے مسافر کو کبھی دھوپ کی حدت اور کبھی غبار سفر کی شدت تھکا دیتی ہے۔اور بعض اوقات یوں بھی کہ رستے اس کے لئے آشنا نہیں رہتے۔بلکہ اجنبی بن جاتے ہیں۔

کچھ دھوپ کچھ غبار سفر نے تھکا دیا
اور یوں بھی ہے کہ آشنا رستے نہیں رہے

اور آخر میں اپنی منزل یعنی شہر جاناں کی رنگینیوں کی سیر کرتے کرتے جب وہ اکتا جاتا ہے۔تو واپس اپنے دشتِ بے کسی کو لوٹ جانا چاہتا ہے۔کہ سفر کا تسلسل ہی اس کا مقصد ہے۔یہی اس کی اصل منزل ہے اور یہی اس کے سفر کا انجام۔

دیکھ لیں اے شہر جاناں سب تری رنگینیاں
اپنے دشت بے کسی کو لوٹ جانے دے مجھے

سہیل ثاقب کے سفر کی یہ روداد گھر کے پر رونق و آباد در و دیوار سے شروع ہو کر تنہائی کے دشتِ بے پایاں کی بے اماں وسعتوں اور ویرانیوں پر ختم ہوتی ہے۔اور ختم کہاں ہوتی ہے؟ ایک نئے سفر کا آغاز ثابت ہوتی ہے۔کہ مرحلہ شوق تو کبھی طے نہیں ہوتا۔اسی کا نام زندگی ہے۔

سہیل کی اس داستانِ سفر کا پیرایہ بیان اگرچہ عام طور پر سادہ ہے۔مگر اس میں ایسی پرکاری بھی ملتی ہے جو سننے والوں کے لئے اس روداد کو دلچسپ اور دلکش بنا دیتی ہے۔پھر اس کا آہنگ اتنا مترنم ہے کہ اس پر نغمے کا گمان ہوتا ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اظہار میں ایک روانی ہے۔جو شاعر کے تسلسل سفر کی عطا ہے۔

سہیل کی غزل سفر کے اس بیان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا موضوع زندگی کی طرح لامحدود اور وسیع ہے۔میں نے سفر کو سہیل کے فن کا کلیدی نکتہ قرار دیا تھا۔لیکن اس مرکزی نقطے کے اطراف میں بہت سے دیگر خطوط اور زاویئے بھی ہیں۔جو اس کے اسلوب کو مزید توانائی اور جامعیت عطا کرتے ہیں۔ان خطوط میں بکھری ہوئی زندگی، جو جمالیاتی طور پر رنگوں، خوشبوؤں، روشنیوں اور آوازوں کے مجموعے کا نام ہے، پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔سہیل کی شاعری میں بھی یہ جمالیاتی عناصر تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی بھٹی میں تپ کر کندن کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔اور یوں اس کی شاعری کو فکر، احساس اور جذبے کی یکجائی نصیب ہوتی ہے۔جو اس کی آواز کو اپنے ہم سخنوں میں ایک اعتبار اور وقار بخشتی ہے۔

یہ مختصر انتخاب میرے دعوے کی دلیل ہے۔

دھیرے دھیرے آسماں تاروں سے خالی ہو گیا
شہر میرا اب مرے یاروں سے خالی ہو گیا

اپنی آنکھوں میں کوئی خواب سجا کر دیکھو
زندگی سامنے ہے، سر تو اٹھا کر دیکھو

کس سے شکوہ کروں! سوئے میں مرے شہر کے لوگ
دکھ ہے اس بات کا' بیدار تو اب میں بھی نہیں

گھر کی اونچائی پہ جاتی ہیں سبھی کی نظریں
کوئی بنیاد کا پتھر نہیں دیکھا کرتا

کچھ ایسی بجھی دل میں ہر اک شمع تمنا
ہم گھر میں چراغوں کو بھی جلنے نہیں دیتے

خشک لب ہوں تو سمجھ لیتا ہوں آئی ہے خزاں
آنکھ نم ہو تو میں برسات سمجھ لیتا ہوں

چراغوں کی طرح کب تک جلاؤں اپنا دل یا رب!
اندھیرا جا چکا ہے' پھر اجالا کیوں نہیں آیا؟

تم اپنا ہاتھ تو مجھ کو دکھاؤ
مجھے اپنا مقدر دیکھنا ہے

ڈاکٹر شفیق ندوی کی شاعری

ڈاکٹر شفیق ندوی ایک متبحر عالم دین' معروف ماہر تعلیم اور ممتاز ادبی' نقاد اور شاعر ہیں۔ علم و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے' کہ وہ ہمہ وقت علمی مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے میدان اظہار میں علم الکلام اور فقہ اسلامی کے علاوہ شعر و ادب بھی شامل ہے۔ فلسفہ و مذہب کا گہرا علمی پس منظر رکھنے والا شخص جب شعر کی طرف توجہ دیتا ہے۔ تو اس کی شاعری میں جہاں معانی کی گہرائی و گیرائی در آتی ہے۔ وہاں اس کے یہاں فکر کی ثقاہت بھی موجزن ہوتی ہے۔ ایک عالم شاعر صرف وجدان ہی پر بھروسا نہیں کرتا' بلکہ خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے وہ زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کو بھی شعوری طور پر ملحوظ رکھتا ہے۔

ہمارے یہاں غالب کے بعد اقبال ہی ایسے شاعر ہیں' جو اپنی علمی سطح کی بلندیوں کو برقرار رکھتے ہوئے شعر کے ذریعے اپنے مخاطب کے دل و نظر کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ ان دونوں مفکر شاعروں نے ہماری پوری شاعری کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا ہے۔ اور آج کون ہے' جو ان کے اثر سے ماورا ہو۔ خاص طور پر غالب کہ بجا طور پر آج بھی وہ سب پر غالب ہے اور اپنے اثر میں زیادہ ہمہ گیر ہے۔ ڈاکٹر شفیق ندوی چونکہ ایک خاص علمی فضا کے پروردہ ہیں۔ چنانچہ ان کا غالب کے فکر و فن سے اثر پذیر ہونا فطری ہے۔ پیش نظر مجموعے ''گل یہ کفِ نازمیں'' ان کا دوسرا مجموعۂ شعر ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ ''ہو نہ گر وعدہ وفا'' منظرِ عام پر آچکا ہے جس کا پیش لفظ محترم مخمور سعیدی نے تحریر فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک ''یہ مجموعہ علمی مشاغل میں منہمک رہنے والے شخص کی شاعری ہے جو شاعری سے ان کے فطری شغف اور گہرے تعلق خاطر کو ظاہر کرتا ہے اور جو ان کی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کا ترجمان ہے۔ جن سے وہ تواتر و تسلسل کے ساتھ گزرتے رہے ہیں۔ ان کیفیات و واردات کے کئی پہلو ہیں۔ بہت سی جہتیں ہیں۔ کہیں غریب

الوطنی کی وہ ہلکی سی چبھن ہے جو اجنبی دیاروں کی بخشی ہوئی آسودہ خاطری میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے اور کہیں آسودہ خاطری کی وہ روشن جھلک ہے جسے کبھی کبھی کوئی پرانی یاد دھندلا کر جاتی ہے۔عصری ماحول کی ناہمواریوں سے بھی وہ صرف نظر نہیں کرتے لیکن اپنے دل کی دنیا سے بھی بے خبر نہیں جو نجی جذبات واحساسات کے نشیب وفراز سے پر ہے"۔

مخمور صاحب کا یہ تبصرہ شفیق ندوی کی شاعری کا ایک مختصر لیکن جامع تجزیہ ضرور ہے۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ رائے یہیں تک محدود ہو۔میرے خیال میں ذرا سی تفصیل کے ساتھ اس بیان میں مزید وسعت کی گنجائش موجود ہے۔ان کی زیادہ تر شاعری غزل پر مشتمل ہے اور مخمور صاحب کی طرح اگر ہم بھی ان کے پہلے مجموعے کے اشعار کا انتخاب پیش کریں تو ان میں اکثر تغزل سے معمور اشعار ملیں گے۔مثلاً

خالی آنکھوں کے لئے خواب سہانے دے جا
کچھ مری جاں مجھے جینے کے بہانے دے جا

جل گئی یاد محل خاک ہوئے سپنوں کے
رہ گئے خط جو ترے پاس پرانے دے جا

نہیں جب ہم میں کچھ باہم مراسم
فسردہ ہم ہیں کیوں' دل کیوں حزیں ہے؟

گئے تھے دیکھنے ہم گل گریباں چاک کر آئے
خوشی کیا خاک ملتی آنکھ ہم نمناک کر آئے

تھا ترا غم کہ رہا ساتھ ہر اک منزل پر
ورنہ اس شہر میں جینے کے سہارے کم تھے

جذبوں کو آنچ دے تو کوئی دے بھی کس لئے
پگھلے گی برف کیا جو ابھی تک جمی نہیں

زمیں ہے تنگ نہ کر تنگ آسماں مجھ پر
جلا ہے گھر تو مسلط نہ کر دھواں مجھ پر

غزل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ہے۔

غزل میں بات دل کی ہم نے کہہ دی
جو گزری وہ اشاروں میں رقم تھی

اور

گھٹا کو زلف کہا چاند اس کے چہرے کو
غزل بھی کیا ہے کرشمہ کسی خیال کا ہے

یہ خیال کا کرشمہ جمالیاتی سطح پر ان سے ایسے خوبصورت اشعار کہلواتا ہے۔

ہاتھوں میں وہی لمس کی خوشبو ہے ابھی تک
کیا لوگ تھے جیسے کہ گلابوں میں ڈھلے تھے

اڑا کے لے گئی خوشبو کسی کے گیسو سے
صبا کے ہاتھ میں جادو یہ کس کمال کا ہے

شاعر معاشرے کا ترجمان اور ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔یہ ترجمانی اور عکاسی کبھی تنقید کا

روپ بھی دھار لیتی ہے۔

کہنے کو اب خزاں کا بھی موسم نہیں رہا
آئی بہار دل کو مگر کیوں خوشی نہیں؟

اداس صبح یہ منظر ہے کیوں دھواں جیسا؟
یقیں کو کیا ہوا؟ لگتا ہے کیوں گماں جیسا؟

سب صاحبانِ علم ہیں سب کج کلاہ لوگ
پوچھو تو کوئی صاحب کردار بھی نہیں

خموش ہوں تو یقیناً ہے مصلحت کوئی
زباں کھلے گی تو مشکل نہیں بیاں مجھ پر

ان کے یہاں اجتماعی لاشعور کی عکاس جدید حیثیت سے پُر اشعار کی بھی کمی نہیں۔ مثلاً

لفظ اب ساتھ معانی کا کہاں دیتے ہیں
برف کو آگ لکھیں پھول کو پتھر لکھیں

بوئے گل ہے تو بکھرنا ہے مقدر اس کا
در کھلا رکھئے کہ در بند ہوا کا کیجے

لے جائے نہ طوفاں کوئی ساحل کو بہا کر
دریا جو چڑھا ہے وہ اترنے کو نہیں ہے

پہلے مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور ان نظموں کی اٹھان صاف بتاتی ہے کہ ان میں بقول مخمور صاحب ان کی غزل سے زیادہ سلاست اور وضاحتِ خیال ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے آئندہ انہیں نظم کی طرف خصوصی توجہ دینے کا مشورہ دیا تھا۔

یہ نظمیں زیادہ تر آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں اور ان میں درونی قافیوں کے التزام نے انہیں غزل کے مترنم آہنگ سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ ان نظموں کے موضوعات پرانی یادوں کی باز گشت کے علاوہ عہد موجود کی مختلف جنگوں کے تناظر میں اس تباہی و بربادی کی نشاندہی کرتے ہیں جس نے تمام عالم انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ''گل یہ کفِ نازمیں'' ہمارے پیش نظر ہے۔ دونوں مجموعوں میں فکر و فن کا ایک فطری ارتقائی سفر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ''ہو نہ گر وعدہ وفا'' کی غزلوں میں غالب کے اثرات کا اگر آغاز ہے۔ تو ''گل یہ کفِ نازمیں'' اس آغاز کو باقاعدہ ایک سفر کی صورت دیتا نظر آتا ہے۔ یہ اثر فنی سطح پر ہو یا فکری، بالواسطہ ہو یا براہ راست، ہر جگہ غالب کی چھاپ گہری دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً

یہ صحرا تو ہماری گرد پا سے بھی بہت کم ہے
گئے آگے بھی ہم ان چاند تاروں سے گزر آئے

جلا کے دل اگر ہم روشنی کے طور ہو جاتے
یہ سورج چاند خود جلووں میں سب محصور ہو جاتے

جائیں گے اس جہاں سے نہ ہم لے کے مسرتیں
کر جائیں گے گناہ وہ جس کی سزا نہیں

لے گئے لکھ کر فرشتے جب مرا سارا حساب
میں اگر پیشِ خدا جاؤں نہ گر جاؤں تو کیا؟

میکدے ویراں پڑے ہیں جام و پیمانہ نگوں
کر لی جب پینے سے توبہ اب گھٹا چھائی تو کیا؟

کسی کا پیرہن یعقوب کی بے نور آنکھوں پر
درِ زنداں سے جیسے اٹھ کے سورج ضوفشاں آئے

غالب اگر تنگنائے غزل سے نکل کر اپنے بیان کی وسعت چاہتے ہیں ۔تو شفیق ندوی بھی اس تنگ دامانی سے نکلنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

لب ورخسار کی میں جلوہ سامانی سے نکلوں گا
غزل! میں اب تری اس تنگ دامانی سے نکلوں گا

وہ حدیث گیسو ورخسار کے علاوہ زندگی کے مادی مسائل کو بھی غزل کا موضوع سمجھتے ہیں

مسائل اور بھی ہیں زندگی کے
حدیث گیسو و رخسار کب تک؟

اس کے علاوہ وہ حدیثِ دل کو استعاروں سے ہٹ کر بھی رقم کرنا چاہتے ہیں ۔

حدیث دل کہاں اب استعاروں میں رقم ہوتی
نئی غزلوں میں گیسو اب کہاں کوئی کمر آئے

اسی طرح غزل میں لہجے کی تازگی کو وہ وقت کا تقاضا قرار دیتے ہیں ۔

لہجے میں تازگی ہو تقاضا ہے وقت کا
کچھ تم غزل سے دور ہو کچھ بانکپن سے میں

اور واقعی جب وہ لب ورخسار وگیسو کی جلوہ سامانی سے نکل کر غزل میں اپنے عصر کے کرب کو محسوس کرتے ہیں تو ایک نیا آہنگ اور نیا اسلوب سامنے آتا ہے ۔جو جدید معاشرتی شعور سے آراستہ ہے ۔اس لہجے کو ہم کہیں غالب کی صدائے کی بازگشت اور کہیں اس کے اسلوب کی بازیافت کہہ سکتے ہیں ۔

سرِ بازار لوگوں نے اچھالیں پگڑیاں سب کی
کوئی جائے بچا کر اب یہاں سے آبرو کیوں کر؟

نہ پہنچا آج تک کیوں کارواں منزل تلک کوئی؟
دکھانے یوں تو ہم کو راستہ اکثر خضر نکلے

سب ہم نوا اگر تھے تو کیوں بزم ناز میں
اٹھی کسی بھی لب سے کوئی کیوں صدا نہیں؟

ڈوبا کہاں پہ جا کے سفینہ نہ پوچھیے
طوفاں میں ساتھ دیتا ہے کب بادباں کوئی؟

ابھی تو خوں بہا مانگے ہے بس مقتول قاتل سے
اٹھے خنجر بکف قاتل کے گھر جائے تو کیا ہوگا؟

اسی طرح جمالیاتی سطح پر بھی وہ غالب کے حسن آفریں ماحول میں سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں ۔اور اسی کے نقطۂ کمال تک رسائی کے خواہاں نظر آتے ہیں ۔

جس طرف دیکھئے چادر ہے دھوئیں کی پھیلی
پیرہن جسم پہ شعلوں کا ہے کمخواب نہیں

کیا کبھی دیکھا ہے خوشبو کا بدن بھی تم نے
ہم نے کل جاتے ہوئے رات کی رانی دیکھی

دلکشی کیا شام کی کیا صبح کی ٹھنڈی ہوا
کہکشاں کا حسن کیا ہے تیری رعنائی کے بعد

یہیں سے تغزل کا وہ شائستہ اسلوب نکھر کر سامنے آتا ہے۔جسے آج کے شعری منظر نامے میں جدید طرز احساس سے معمور ایک توانا اور محکم روایت کی حیثیت حاصل ہے۔چند شعر دیکھئے۔

کھلیں گے در تو ہمارا بھی کچھ بھلا ہوگا
بہت ہی حبس ہے تازہ کوئی ہوا آئے

نظر ملا کے حقیقت وہ خواب کر دیتا
بڑھا کے پیاس وہ دریا سراب کر دیتا

میں نہ کہتا تھا کہ آساں نہیں واپس ہونا
اس کی آنکھیں ہیں سمندر کوئی پایاب نہیں

خوشبو اڑا کے زلف سے بادِ صبا چلی
آنچل یہ کس کا ہاتھ میں لے کر ہوا چلی

دشت ہے آج تو کل قریۂ جاں بھی ہوگا
دل میں ہے خوں کبھی آنکھوں سے رواں بھی ہوگا

راہ دشوار ہے کرنا ہے سفر کیا کیجے
ہر قدم پیاس ہے، صحرا میں ہے گھر کیا کیجے

رات ہے جنگل، چمک جگنو کی ہے
تیز بارش ہے ہوا ہے اور بس

سفر ظلمات کا رخ بھی مخالف ہے ہواؤں کا
سلامت کیوں ہے طوفاں میں مگر یہ بادباں اب بھی

دیکھنے آئے ہیں جو تاج محل شہروں سے
دل کا ویران شبستاں مرا گھر کب دیکھیں؟

غزل اب بھی ہمارے ادب کی پہچان اور شاعری کی آبرو ہے۔رمز و ایما کے پیرائے میں فکر و خیال کی گہرائی و گیرائی اور جذبہ و احساس کی رعنائی و زیبائی کے ساتھ ساتھ روح عصر کی ہم نوائی اور لمحہ موجود کی شعور آرائی جس قوت اور توانائی سے صنفِ غزل میں موجود ہے۔وہ کسی اور میں نہیں۔لفظ کی حرمت اور فن کا تقدس اس کا حصہ ہے۔اور معانی کی ترسیل و توسیع اس کا خاصہ۔ ذات و کائنات کے آلام کا بیان ہو یا انفس و آفاق کا تخلیقی وجدان،غزل ہی کے بطون کا فنی اظہار ہے۔بے پناہ تخلیقی امکانات سے معمور ہماری غزل آج بھی پہلی سی وضعداری کے ساتھ زندہ و پائندہ ہے۔اور ہمارے غزل گو آج بھی ریاضتِ فن کے لئے اسی ہزار پہلو پیکر پر فریفتہ ہیں۔شفیق

ندوی بھی اپنے مترنم اور متوازن لب و لہجے کے ساتھ بنیادی طور پر اسی رخشندہ و تابندہ صنفِ سخن کی زلفوں کے اسیر ہیں ۔لیکن وہ جو فیض نے کہا ہے۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے

جب وہ فکری سطح پر اپنی ذات کی شکست و ریخت کے گرداب سے ابھر کر اجتماعی لاشعور کی موجوں پر کائنات کے آفاقی مسائل و مشاکل سے نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں ۔تو صنف نظم کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں ۔کیونکہ غزل اگر شاعر کے بطون کا فنی مظہر ہے ۔تو نظم اس کے خارج کا منظر نامہ ۔شفیق ندوی کی نظمیں اس مجموعے میں ان کے نقش اول سے جہاں تعداد میں زیادہ ہیں ۔وہاں اسلوب اور آہنگ کے اعتبار سے بھی ان سے ایک قدم آگے ہیں ۔اور ایسا ہونا بھی چاہئے کہ یہ ان کا نقش ثانی ہے ۔

ان نظموں کے موضوعات بھی متنوع ہیں ۔نظم ''حرفِ اول'' میں شاعر نے جھوٹ کو سچ لکھنے کے تاریخی المیئے کو موضوع بنایا ہے ۔جبکہ ''تکوین'' میں تخلیق کائنات کے اولین لمحے کی عکاسی کی گئی ہے ۔''ذرے بھی خدا ہوتے ہیں'' ایٹم کے سائنسی نظریئے کی تعبیر اور اس کی ہولناکی و بربادی کی تصویر ہے ۔''دمِ واپسیں'' زلزلے جیسے ہلاکت خیز حادثے کے بعد موت کی سی ویرانی اور ''پلک جھپکنے تک'' سونامی کی طوفان خیز موجوں کی تباہی کا بیانیہ ہے ۔''احتجاج خالصتاً ایک سیاسی مظاہرے کا منظر نامہ ہے ۔''بوڑھی نائکہ'' ڈھلتی جوانی کا نوحہ ہے ۔تو ''بلاعنوان'' عہد حاضر کے نوجوانوں کی ذہنی بے راہروی کا مرثیہ ۔اسی طرح ''کنوارا آنگن'' کنوارپنے کا المیہ ہے ۔''کرب تنہائی'' 'ملاقات'' ''صورت نہیں تردید کی'' ''سرِ راہ چلتے چلتے'' ''جو شاعری کا سبب ہوا'' ''تفریح'' اور ''خواب'' یہ ساری نظمیں رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج ہیں اور جوانی کے سہانے خوابوں اور محبت کی واردات کا دل نشیں بیان ہیں ۔

ان نظموں کا آہنگ خوبصورت ہے ۔درونی کافیوں کے التزام نے ان میں ایک نغمگی کی سی کیفیت پیدا کردی ہے ۔مختلف مصرعوں میں تنوع اور زبان میں غزل کی سی شعریت ہے ۔تمام

نظمیں اپنے موضوع کی اکائی کا بھرپور تاثر سے بیان کرتی ہیں اور ان میں فکر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی جمال آفرینی پوری طرح موجود ہے ۔اور یوں اس صنف میں بھی شاعر نے اپنی تخلیقی ثروت مندی کا واضح ثبوت پیش کیا ہے ۔

نظم ہو یا غزل' ڈاکٹر شفیق ندوی کا لہجہ ہر جگہ نرم اور پر وقار ہے ۔زبان و بیان کی فصاحت و لطافت کے ساتھ ساتھ معنوی بلاغت و جامعیت ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ان کی زبان زیادہ تر سلیس ہے اور اس پر کہیں کہیں مقامی روزمرہ کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے ۔لیکن مجموعی طور پر یہ لہجہ سموجود کی وہ شعری زبان ہے جسے قبول عام حاصل ہے ۔

ان کے موضوعات اپنے عہد سے پوری طرح وابستہ و پیوستہ ہیں ۔محبت ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے ۔اور عصر رواں کا کرب روح اور دورِ حاضر کا سوزِ آگہی ان کے فکر و فن کا محور ہے ۔وہ مشرق کی محکم و ثقہ ادبی روایت سے جڑے ہوئے ایک روشن خیال اور جدید حسیت کے حامل شاعر ہیں ۔

ان کا یہ مجموعہ معاصر شاعری کے یہ کفِ ناز میں ایک سدا بہار گلاب کی مانند ہے ۔جس نے اپنے رنگ و بو کی تازگی کے باعث قارئین کی بھرپور توجہ حاصل کی ہے ۔

ان کا تیسرا مجموعۂ کلام ''قریۂ جاں'' ہمارے پیش نظر ہے ۔گزشتہ تین سال کے مختصر عرصے میں ماشاءاللہ یکے بعد دیگرے ان کے تین مجموعے آئے ہیں ۔ان سے دو باتیں ظاہر ہیں ۔ایک تو یہ کہ انہیں ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے ۔دوسرے ان کا تخلیقی وفور اس قدر ہے کہ ان سے ایسے کئی اور مجموعوں کی توقع کی جاسکتی ہے ۔بہر حال ادبی دنیا میں ان کا ورود خوش آئند ہے ۔

ہم نے ان کے پچھلے مجموعۂ سخن ''گل یہ کفِ نازمیں'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان کے پہلے اور دوسرے مجموعے میں فکر و فن کا ایک ارتقائی سفر صاف دکھائی دیتا ہے ۔''ہو نہ گر وعدہ وفا'' کی غزلوں میں غالب کے اثرات کا اگر آغاز ہے تو ''گل یہ کفِ نازمیں'' اس آغاز کو باقاعدہ

ایک سفر کی صورت دیتا نظر آتا ہے۔ یہ اثر فنی لحاظ سے ہو یا فکری سطح پر، بالواسطہ ہو یا براہِ راست، ہر جگہ غالب کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ موجودہ (تیسرے) مجموعے میں بھی یہ اثر نہ صرف قائم ہے۔ بلکہ اس کا سفر تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ مثلاً

اپنی ہی کرتا ہے، سنتا ہی نہیں کچھ میری
کس قدر ناز ہے اپنے پہ، خدا ہو جیسے

ہے کیا زندگی؟ سلسلہ بس نفس کا
یہی ہے تو پھر جاں لٹانے میں کیا ہے؟

آتشِ گل سے بھی اٹھتا ہے دھواں جانتے ہیں
کم ہیں وہ لوگ، جو یہ رازِ نہاں جانتے ہیں

میں کبھی سبزہ کبھی کائی کبھی پانی میں ہوں
دیکھنا ملبوس ہو کر بھی میں عریانی میں ہوں

ان اشعار میں فکری اکتساب کے علاوہ لفظیات میں بھی زیادہ تر غالب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن ندوی کے یہاں اس چراغ کی لو سے جو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے جہاں بہت سے چراغوں کو روشن کرنے میں مدد ملتی ہے۔ وہاں اس روشنی میں عصرِ رواں کا چہرہ اور زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔

اسی مٹی میں سانسیں دفن ہیں میرے بزرگوں کی
میں اس وادی سے کیسے اتنی آسانی سے نکلوں گا

بستیاں دیکھنا ہوں گی اک دن
جیسے برباد ہوا صحرا کوئی

نہیں اب مسئلہ دیوار و در کا
یہاں خطرے میں اب بنیاد بھی ہے

جو صحرا تھے رہے پیاسے کے پیاسے
سمندر پر ہی بادل آ کے برسے

غزل کے کلاسیکی آہنگ میں جدید حسیت تخلیقی سطح پر کس طرح اظہار کرتی ہے۔ دیکھئے۔

لگے گا وقت اب اٹھنے میں تھوڑا
زمیں پر آ گرا ہوں آسماں سے

موسم ہے رنگ گل کا ٹھہر جاؤ اب ذرا
جانے کے شہرِ جاں سے زمانے ہیں اور بھی

یہ اور بات ہے میں یاد اب نہیں اس کو
مجھے جو بھول گیا درد آشنا بھی تھا

فقیہہ شہر اسے کیوں نہ دیکھنا چاہے
گلاب اس کو ہر اک صبح کھل کے دیکھتے ہیں

لکھا ہے نام کوئی ساحل سمندر پر
مرا بھی نام ہے، میں نے مگر لکھا تو نہیں

غزل کے اس فنی ارتقاء میں شاعر کی جانب سے ایک نئی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ اور وہ ہے مختصر بحروں کی طرف سفر۔ چنانچہ اس مجموعے میں جو غزلیں مختصر بحر میں ہیں۔ وہ زیادہ پر اثر اور تازگی سے معمور بھی ہیں اور ایجاز و اختصار کا خوبصورت نمونہ بھی۔ مثلاً

جو کرنا مشورہ بس دل سے کرنا
خرد پر اعتبار اتنا نہ کرنا

غزل میں آ گیا پیکر تمہارا
میں شاید بڑھ گیا حد بیاں سے

یہ کنارے پہ ہے جینا کب تک
ڈوب مرنے میں پریشانی کیا؟

پتھر کی دیواریں ہیں
شیشے کی پیشانی ہے

پتھر کا اک ٹکڑا تھا
چمکا جب وہ طور ہوا

در و دیوار پر دھبے لہو کے
کرشمہ ہے یہ کس رنگِ حنا کا

شفیق ندوی کے یہاں شروع ہی سے غزل کے پہلو بہ پہلو نظم کی طرف خاص توجہ ملتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعے میں بارہ جبکہ دوسرے مجموعے میں سترہ نظمیں شامل تھیں۔ اور اب اس تیسرے مجموعے میں بھی بارہ نظمیں شریک ہیں۔ ان نظموں میں بھی ارتقاء کا ایک غیر محسوس سفر معلوم ہوتا ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے تو ان میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ لیکن فنی طور پر خوب سے خوب تر کی تلاش صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہ ساری نظمیں آزاد ہیئت میں ہیں۔ اور اس فارم کے بیشتر تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ ان میں حسبِ سابق درونی قافیوں کا التزام بھی برقرار ہے۔ جس نے انہیں غزل کی سی غنائیت سے قریب تر کر دیا ہے۔ اور زبان کے اعتبار سے بھی اب ان میں زیادہ نکھار محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح مصرعوں کی تقسیم اور ترتیب کے لحاظ سے بھی ان میں اب ایک خاص سلیقہ نظر آتا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان نظموں کو دیکھا جائے تو ان میں زیادہ تر رومان اور حقیقت کا ایک حسین امتزاج ہمیں نظر آتا ہے۔ جو ندوی صاحب کی پوری شاعری کا عمومی مزاج ہے۔ آیئے ان نظموں کا ایک مختصر جائزہ لیں۔

''کرسٹینی'' ایک ایسی نظم ہے جس میں مجرد حُسن کا پرتو مختلف ساحلوں پر دکھائی دیتا ہے۔ اور شاعر ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

''انتظار'' میں شاعر برسوں سے کسی کے انتظار میں مشغول نظر آتا ہے۔ بقول اس کے۔

تمام آج بھی
منظر وہی پرانا ہے
مگر کوئی یہاں
اپنا نظر نہیں آتا

اور آخر تھک ہار کر کہہ دیتا ہے۔

ہر اک نگاہ میں
منظر دھواں دھواں کیا ہے؟

''پجارن'' میں ایک پجارن سکون کی تلاش میں مندر میں آتی ہے۔اور ایک پجاری سے ملاقات کے باوجود اسے وہاں بھی سکون نہیں ملتا۔

''سرخی ڈوبتے سورج کی'' اس نظم میں ساحلِ سمندر پر غروب آفتاب کا دلنشیں منظر اجاگر کیا گیا ہے۔ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی میں شاعر ایک دلفریب خواب دیکھتا ہے۔اور پھر جلد ہی عالمِ بیداری میں اسے حقیقت کی سنگینی کا شدت سے احساس ہو جاتا ہے۔

''انتظار قیامت کا'' میں شاعر نے مختلف مناظر کے حوالے سے ذروں کی حقیقت بیان کی ہے۔اور قیامت میں ان ذروں کے سمٹنے کا اشارہ دیا ہے۔گویا قیامت کے نظارے کو چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

''جرمانہ'' میں زلزلے کے ایک ہولناک منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔یہاں زلزلے کو زمین کی انگڑائی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس آفتِ ارضی کو انسانوں کی خطاؤں کا شاخسانہ قرار دیا گیا ہے۔جس کا جرمانہ اکثر بے خطا اور بے قصور لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

''میں اور راستہ'' ایک نفسیاتی نظم ہے جس میں ذات کے سفر کی مختصر روداد بیان کی گئی ہے اور اس میں اوّل تا آخر اس سفر کے مختلف مراحل کا ادراک کیا گیا ہے۔

''دعوتِ نظارہ'' میں ساحلِ سمندر پر ایک حسن مجسم کا منظر دکھایا گیا ہے جو سراپا دعوتِ نظارہ ہے۔

''ممبئی کے نام'' میں شہر ممبئی کی رنگا رنگ زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

''کُن فکاں'' ایک ایسی نظم ہے جس کا موضوع کائنات کے اسرار کی تلاش ہے۔جب زمانہ نہیں تھا۔تو دھماکہ (Big Bang) کب ہوا تھا؟ یہ ایک معمہ ہے۔اور اسی معمے کو سلجھاتے

سلجھاتے آخر شاعر کہہ اٹھتا ہے کہ شاید یہی دھماکہ ہی اصل میں کن فکاں تھا۔

''خیالِ خام'' میں شاعر ماضی کے ان سنہری دنوں کو یاد کرتا ہے۔جب وہ اور اس کا محبوب باہم محبت آشنا تھے۔مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک خیالِ خام تھا۔اور اب حقیقت یہ ہے کہ وہ ذات کے قید خانے میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اس نظم کا موضوع مسلمانوں کے باہمی فسادات ہیں۔شاعر دردمند دل کے ساتھ سوچتا ہے کہ کلمہ گو ہو کر بھی وہ آپس میں بغیر کسی خاص وجہ کے ایک دوسرے کو کیوں قتل کر رہے ہیں؟ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق کی بدولت دنیا میں عروج و کمال حاصل تھا۔اور آج افتراق و انتشار نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔یہ نظم گویا دورِ حاضر کے حالات میں قارئین کو ایک لمحۂ فکریہ عطا کرتی ہے۔

ان نظموں میں اظہار و بیاں کے اعتبار سے جہاں ایک تازگی ہے۔وہاں فنی لحاظ سے بھی ایک ایسی پختگی ہے جو ندوی صاحب کو نظم کا ایک کامیاب شاعر قرار دینے کے لئے کافی ہے۔اور اس میدان میں ان کے روشن مستقبل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

غزل ہو کہ نظم مجموعی طور پر شفیق ندوی کی شاعری کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی لمحۂ موجود کے شعور و آگہی سے بھی آراستہ اور مزین ہے۔اور اس میں عہد رواں کی حسیت اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔وہ اپنے فکری و فنی سفر پر مسلسل رواں دواں ہیں اور آج بھی ان کا یہ سلسلۂ شوق پوری توانائی سے جاری و ساری ہے۔

☆☆☆☆☆☆

شوکت جمال کی شوخ بیانی

منز ومزاح کسی بھی ادب کا اہم حصہ ہے ۔یہ الگ بات کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے اس میں فرق ہو۔لیکن شگفتہ تحریروں کی بہر حال اپنی ایک اہمیت ہے ۔ایک شگفتہ نگار اہل قلم کم سے کم لفظوں میں معاشرے کے دکھوں کی نہ صرف نشاندہی کرتا ہے بلکہ بعض اوقات زخموں پر وہ ایسا پر اثر مرہم بھی رکھتا ہے جو عام حالات میں لمبے چوڑے مقالوں سے بھی ممکن نہیں ۔چاہے اس کے لئے اس طنز کے تیز نشتر سے کام لینا پڑے یا صرف مزاح کے لطیف وزم پھولوں کی گدگدی سے۔ اور بعض اوقات یہ دونوں کام وہ بیک وقت بھی انجام دیتا ہے ۔یعنی طنز ومزاح کا ایسا امتزاج پیش کرتا ہے کہ طنز کو مزاح سے اور مزاح کو طنز سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔بہر حال شگفتگی دونوں صورتوں میں ضروری ہے۔

ہمارے یہاں نثر میں فرحت اللہ بیگ سے لے کر عظیم بیگ چغتائی تک اور پطرس بخاری اور شوکت تھانوی سے لے کر مشتاق احمد یوسفی اور شفیق الرحمٰن تک اور نظم میں اکبر الہ آبادی سے لے کر مجید لاہوری تک اور ضمیر جعفری سے انور مسعود تک لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے شگفتہ ادب کی تخلیق میں حصہ لیا ہے ۔ویسے تو طنز ومزاح نثر میں بھی مشکل کام ہے لیکن شاعری میں اسے کامیابی سے نبھانا اور بھی مشکل ہے ۔کہ یہاں نثر سے کہیں زیادہ اختصار وایجاز کی ضرورت ہوتی ہے۔

سعودی عرب کے شگفتہ نگار ادیبوں اور شاعروں میں تازہ ترین مجموعہ شوکت جمال کا ''شوخ بیانی'' ہے ۔جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ان سے پہلے صفدر حسین' ڈاکٹر عابد معز' مرزا یوسف رہبر' مہزاد سحر' جعفر رضوی اور نسیم سحر کی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں ۔ان سب میں ''شوخ بیانی'' کو یہ خصوصیت اور امتیاز حاصل ہے کہ اسے نہایت اہتمام سے نفیس کاغذ پر عمدہ کتابت وطباعت

کے ساتھ شائع کیا گیا ہے ۔مزاحیہ شاعری کے کم ہی ایسے مجموعے ہوں گے ۔جنہیں اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔''دیوانچہ'' کے بعد ان کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے ۔جو ان کی مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے ۔جس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ۔

شوکت جمال سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز ومزاح ہی ان کا اصل حوالہ ہے ۔انہوں نے غزل ایسی متین اور شائستہ صنفِ سخن' جو زیادہ تر معاملاتِ حسن وعشق کے لئے مخصوص ہے ۔اس میں بھی مضحک صورتحال پیش کر کے مزاح کے دھنک رنگ پھول کھلانے کی کوشش کی ہے ۔اور اسے ہزل کی بجائے غزل ہی کا نام دیا ہے ۔مثلاً یہ چند شعر دیکھئے۔

رخسار و زلف و لب کی وہ سنتے رہے صفات
تل کا ہوا جو ذکر تو وہ تلملا گئے

قدموں میں کب وہ میرے گر کر مچل گئے ہیں
کیلے کا تھا وہ چھلکا جس پر پھسل گئے ہیں

بچپن کی دل لگی کا یہ انجام دیکھئے
پیری نے آلیا انہیں جب میں بڑا ہوا

کل میکدے میں ''سیل'' کا منظر عجیب تھا
زاہد بھی تھے سروں پہ اٹھائے ہوئے گھڑے

تشنہ لبی کے ذکر پہ بولے کہ چپ رہو
تم کو ابھی نظر سے پلائی گئی تو ہے

بھلا کیسے چلیں ہمراہ دونوں دشت الفت میں
کہ لیلیٰ اونٹ پر بیٹھی ہے اور مجنوں پیادہ ہے

کرتے ہیں عشق کو بھی یہ عاجز شبِ فراق
اور نیند حسن کی بھی اڑاتے ہیں لال بیگ

آپ نے دیکھا کہ ان اشعار میں زیادہ تر غزل ہی کی روائتی لفظیات سے شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اور غزل میں یہ تجربا سے شگفتہ غزل کا نام دینے پر مجبور کرتا ہے۔

شوکت جمال نے ہماری سیاسی اور سماجی ناہمواریوں کو اپنی شاعری کا اس طرح موضوع بنایا ہے کہ کہیں بھی معیار گرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔مثلاً

چناؤ سر پہ آئے ہیں چلیں گے پھول گیندے کے
گلوں میں لیڈروں کے پھر ڈلیں گے پھول گیندے کے

مکاں کرائے پہ دے کر جو لوگ خوش تھے بہت
عدالتوں میں ہیں وہ لوگ اب مکاں کے لئے

کترا کے نکل جا کہ اسی میں ہے بھلائی
جب بھی کوئی اپنا کسی تھانے میں کھڑا دیکھ

تنخواہ جو پوری نہ ہو بیگم کے حوالے
رہتا ہے سدا گھر میں فسادات کا کھٹکا

جھانکتا ہی رہ گیا لیڈر بغل جلسے میں کل
مانگ کر لایا تھا جو تقریر کوئی لے اڑا

میں سرکاری ملازم ہوں یہی ہے نوکری میری
کہ دفتر آگیا ہوں میں مگر بیکار بیٹھا ہوں

وہ اتنی دیر کر دیتے ہیں سجنے اور سنورنے میں
کہ شادی کے بلاوے میں پس ماتم ہی جاتے ہیں

کرسی کی تین ٹانگیں ہیں ٹوٹی ہوئی تو ہوں
کرسی نہ چھوڑ کچھ بھی ہو اس پر ضرور بیٹھ

ان کی بے ساختگی کا اعجاز ان کے قطعات میں زیادہ نمایاں ہے۔مثال کے طور پر یہ دو قطعات ملاحظہ کریں۔

ایک قطعے کا عنوان ہے" شکست آرزو"

ہر فرد اس کے گھر کا مرے ساتھ ساتھ تھا
جذبات ہو رہے تھے مرے لوٹ پوٹ سے
لڑکی نے رائے دی تو وہ میرے خلاف تھی
ہارا ہوں انتخاب فقط ایک ووٹ سے

اور دوسرے قطعے کا عنوان ہے" خوشخبری"

میاں نے آ کے خوشخبری سنائی جب یہ بیگم کو
کہ اپنی زندگی کا آج ہم بیمہ کرا لائے
کہا بیگم نے یہ تم نے بہت اچھا کیا لیکن
خوشی تو ہے وہی سچی کہ پیسہ ہاتھ جب آئے

بے تکلفی کا کمال دیکھنا ہو تو ان کی نظمیں دیکھئے۔خاص طور پر عقیقے کا گوشت، جشن مسرت،

نقش جدید لیلیٰ ومجنوں کاشکوہ جواب شکوہ اورامداد باہمی۔

تضمین کا فن عام طور پر سنجیدہ شاعری میں ابلاغ میں وسعت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن شوکت جمال نے اسے اپنے شگفتہ اسلوب میں استعمال کر کے اس کی تاثیر کو دوچند کر دیا ہے۔

جدید فیشن کی کرامات نے نوجوانوں میں تذکیر وتانیث کا سارا فرق مٹا کے رکھ دیا ہے۔ غالب کی زمین میں ایک خمسے کا بند دیکھئے۔

گزرے وہ چھلاتے ہوئے جھمکا مرے آگے
لاکٹ ہے تو کنگن ہے تو چھلا مرے آگے
رہتا ہے ہمیشہ ہی یہ خطرہ مرے آگے
لڑکی مرے آگے ہے کہ لڑکا مرے آگے
"ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

اوراسی طرح ایک اور تضمین دیکھئے۔

بیگم کے ہیں جو میں نے اٹھائے ہیں یہ تھیلے
اپنا انہیں کہنے کو میں تیار نہیں ہوں
بل میں نے دکانوں پہ چکائے تو ہیں لیکن
"بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں"

اسی طرح پیروڈی کی صنف کو بھی انہوں نے کامیابی سے برتا ہے۔مثلاً نظیر اکبرآبادی کی معروف نظم "آدمی نامہ" کی پیروڈی "آرمی نامہ" کے نام سے کی ہے۔اختر شیرانی کی نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کو "یہی صحرا ہے وہ ہمدم جہاں دیوانہ رہتا تھا"۔اورجاوید اختر کے مشہور فلمی گیت "ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا" کے مقابلے میں "ایک لیڈر کو دیکھا تو ایسا لگا"۔

غرض شوکت جمال کی "شوخ بیانی" میں ظرافت ولطافت کے تمام معروف پہلوؤں اورخاص طور پر بے تکلفی اور بے ساختگی کے علاوہ ایک خاص شائستگی توازن اورتازگی کا ایسا سدا بہار احساس موجود ہے جو ان کے فکروفن کو دوسرے لکھنے والوں میں ایک امتیاز بخشتا ہے۔

صفدر حسین..........بچوں کے مقبول ادیب

سعودی عرب میں مقیم اہل قلم میں صفدر حسین کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔وہ نہایت وجیہہ' دلچسپ اور وضعدار شخصیت کے حامل تھے۔یاروں کے یار۔عمر کا بڑا حصہ انہوں نے سعودی عرب میں گزارا۔تقریباً ۷۶ سال تک زندہ رہے۔بڑھاپے میں بھی نہایت چاق وچوبند اور شگفتہ مزاج۔آخر عمر تک ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ قائم رہا۔انہیں اردو' فارسی اور انگریزی پر عبور تھا۔عربی بھی جانتے تھے۔خوش طبعی' ظرافت اور زندہ دلی ان کا خاصہ تھا۔وہ تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف تھے۔ادب میں ان کی بہت سی حیثیات ہیں۔وہ مختلف موضوعات پر بلا تکان لکھتے تھے۔شاعر' مورخ' مولف اور مترجم کے علاوہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار بھی تھے۔لیکن ان کی ایک حیثیت ایسی ہے جو ان کی پوری شخصیت پر چھائی ہوئی ہے اور وہ ہے بچوں کے ادیب کی حیثیت۔انہوں نے بچوں کے لئے اتنا زیادہ اور اتنا اچھا لکھا ہے کہ ہم انہیں بچوں کا ایک کامیاب اور مقبول ادیب کہہ سکتے ہیں۔

بچوں کے لئے لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔اس کے لئے لکھنے والے کو بچوں کی ذہنی سطح کے قریب آنا پڑتا ہے۔یعنی خود بچہ بننا پڑتا ہے۔اور یہ کام آپ جانتے ہیں ایک بڑی عمر کے آدمی کے لئے آسان نہیں۔ہمارے جن ادیبوں کو بچوں کے ادب میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔انہوں نے بچوں کی ذہنی سطح کے قریب رہ کر یہ مشکل کام انجام دیا ہے۔صفدر حسین بھی انہی میں سے ایک تھے۔

عام طور پر ان کا طرز تحریر سادہ اور آسان تھا۔وہ جس موضوع پر لکھتے۔اس سے متعلق مستند معلومات کا ذخیرہ دے دیتے۔لیکن اس طرح نہیں کہ پڑھنے والوں کو صرف خشک معلومات اور اعداد وشمار مہیا کر دیتے۔بلکہ ان تمام معلومات کو دلچسپ' شگفتہ اور عام فہم انداز میں یوں بیان کرتے کہ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا۔بچوں کے لئے ان کی تحریروں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

وہ ہندوستان کے اردو پڑھنے والے بچوں میں اسی بنا پر بے حد مقبول تھے۔انہیں تاریخ اور سوانح سے خاص دلچسپی تھی اور اس فن کے وہ ماہر تھے۔اکثر کتابیں بڑے اہتمام سے خود شائع کرتے۔جو بعد میں ان کی اجازت سے سرکاری اداروں کے تحت بھی چھپتیں۔کئی کتابوں پر انہیں حکومت کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا گیا اور ادبی حلقوں میں ان کی خاص پذیرائی ہوئی۔ایسی ہی چند کتابوں کا ذکر ہم یہاں کرنا چاہیں گے۔

''ہمارے ٹیگور'':

اس کتاب میں انہوں نے بنگالی زبان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کے مجموعۂ کلام ''گیتان جلی'' کا مختصر تعارف بھی پڑھنے والوں سے کرایا ہے۔اور اس میں سے شعری انتخاب کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔گویا ٹیگور کا یہ ایک مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔نہایت آسان زبان میں بچوں کے لئے یہ بے حد معلوماتی اور دلچسپ کتاب ہے۔ڈیمائی سائز کے ۷۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۷ء میں ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا اور اس پر ہندوستان کی وزارتِ تعلیم نے مصنف کو انعام بھی عطا کیا۔

''ہمارے نہرو''

کراؤن سائز کی یہ کتاب ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور حکومتِ ہند کے پبلی کیشن ڈویژن نے اسے شائع کیا اور آندھرا پردیش کی حکومت نے اس پر صفدر صاحب کو انعام سے نوازا۔اس کتاب میں ہندوستان کے سابق وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی کے حالات آسان زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔جگہ جگہ تصاویر نے کتاب کی دلچسپی اور خوبصورتی میں اضافہ کردیا ہے۔

''گاندھی جی کی کہانی''

یہ کتاب بھی حکومت ہند کی انعام یافتہ ہے۔اس میں مہاتما گاندھی کے سوانح حیات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔مختلف تصاویر نے کتاب کی افادیت کو دوچاند کردیا ہے۔

''ہماری اندرا گاندھی''

درمیانے سائز کی یہ کتاب ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اور اسے پارس پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔اس پر بھی ہندوستان کی حکومت نے مصنف کو انعام دیا تھا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس کتاب میں ہندوستان کی سابق وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کے حالات زندگی کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ دلچسپ انداز میں رقم کیا گیا ہے۔

''ہندوستان کی بزرگ ہستیاں''

اس کتاب کے حصہ اول و دوم کا پہلا ایڈیشن پارس پبلی کیشن حیدرآباد نے شائع کیا تھا جبکہ دوسرے ایڈیشن حصہ اول کو ۱۹۹۷ء اور حصہ دوم کو ۱۹۹۸ء میں ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا۔

''ہمارے آروبندو گھوش''

۷۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ۱۹۷۶ء میں آروبندو گھوش کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔اس پر بھی مصنف کو حکومت وقت نے انعام سے نوازا۔

''ڈاکٹر ذاکر حسین''

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اس کتاب کا موضوع ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی آسان زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔یہ کتاب ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اور یہ بھی حکومتِ ہند کی انعام یافتہ ہے۔

''ہندوستان کی عظیم عورتیں''

۹۵ صفحات پر محیط اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں ترقی اردو بورڈ نے شائع کیا تھا۔اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے متعلق ہندوستان کی گیارہ معروف عظیم خواتین کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔

''سبھاش چندر بوس''

اس کتاب کے ۱۲۰ صفحات ہیں اور ۱۹۹۷ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن صفا پبلی کیشنز حیدرآباد

نے شائع کیا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔یہ کتاب تحریک آزادئ ہند کے مشہور رہنما سبھاش چندر بوس کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

''آندھرا کیسری پرکاشم پنتلو''

پارس پبلی کیشنز حیدرآباد نے مشہور ہندوستانی شخصیت پرکاشم پنتلو کی صد سالہ سالگرہ پر یہ کتاب شائع کی جس کے کل ۷۶ صفحات ہیں۔

''ہمارا دوست ایران''

مملکت ایران کے ڈھائی ہزار سالہ جشن تاسیس کے تاریخی موقع پر یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ یہ معلوماتی کتاب قارئین میں بے حد دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔

''ٹیپو سلطان''

۱۹۹۰ء میں پارس پبلی کیشنز حیدرآباد کی طرف سے یہ کتاب شائع ہوئی۔۷۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں برصغیر کے مشہور مجاہد آزادی' شیر میسور ٹیپو سلطان کے مختصر حالاتِ زندگی نہایت آسان اور عام فہم زبان اور دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

''امیر خسروؒ''

مشہور صوفی بزرگ اور شاعرِ ہفت زبان حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی سات سوویں سالگرہ کے موقع پر یہ کتاب ۱۹۹۷ء میں شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کی۔۷۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں حضرت امیر خسروؒ کے حالات زندگی اور ان کے ادبی اور فنی کمالات کا مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔

''پٹرول کی کہانی''

۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جلی کتابت کے ساتھ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں دورِ حاضر کی ایک اہم ضرورت پٹرول کو موضوع بنایا گیا ہے۔آسان اور سادہ زبان میں بچوں

کو پٹرول کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔انداز بیان دلچسپ ہے۔

''ڈاکٹر اُمبیڈکر کی کہانی''

۷۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں پارس پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کی۔اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر اُمبیڈکر کے حالات زندگی کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

''فلسطین''

۱۹۹۰ء میں ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب پارس پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کی تھی۔اس کتاب میں فلسطین کی تاریخ اور موجودہ دور میں اس کی سیاسی اہمیت پر آسان زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

''مدر ٹریسا''

بین الاقوامی شہرت کی حامل معروف سماجی خدمت گزار خاتون مدر ٹریسا کے انتقال پر ۱۹۹۷ء میں یہ کتاب شائع ہوئی جس کے صفحات ۸۸ ہیں۔اس کتاب میں مدر ٹریسا کی زندگی کے تمام اہم واقعات سادہ اور آسان لفظوں میں تحریر کئے گئے ہیں۔

ان تمام کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ انہیں بنیادی طور پر بچوں کے لئے لکھا گیا تھا لیکن اپنی افادیت کے اعتبار سے انہوں نے بڑوں کی دلچسپی کو بھی اپنی طرف مبذول کیا۔ان تصانیف میں مصنف نے بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق سادہ' آسان اور عام فہم الفاظ میں مختلف موضوعات پر ضروری اور مفید معلومات بیان کی ہیں۔جو بچوں کے سوانحی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔یوں جہاں ان کے ذریعے نئی پود کی ذہنی تعلیم اور تربیت کا اہم فریضہ ادا کیا گیا ہے۔وہاں عام قارئین کے استفادے کے لئے بھی دلچسپی کا وافر سامان ان میں موجود ہے۔اور یہ صفدر حسین مرحوم کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

طارق محمود طارق کا تیسرا موسم

طارق محمود طارق نئی نسل کے ان غزل گو شعرا میں شامل ہیں۔جن کے یہاں غزل نہ صرف غم ذات کے اظہار کا وسیلہ ہے' بلکہ ذات سے باہر کائنات کے مسائل وافکار کے ادراک وعرفان کا ذریعہ بھی ہے۔ وہ ایک باشعور اور حساس فنکار ہیں۔ان کا نظریۂ فن صداقت اور جرأت سے عبارت ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرح کی منافقت کے خلاف ہیں۔

میرے ہاتھ میں رہے میرے قلم کی آبرو
بات جو سوچوں' وہی تحریر ہونی چاہئے

وہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں اور اپنے بیان میں کسی قسم کی مصلحت کو روا نہیں رکھتے۔

حرف و معنی کا اثر جاتا رہا
جب ہوئی تحریر میں آلودگی

چنانچہ وہ خیر وشر کی آویزش میں قلم کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں۔

میرا ہتھیار ہے قلم میرا
اسلحے کی تمہیں ضرورت ہے

انہیں خود سے بڑھ کر دوسروں کے دکھ درد کا زیادہ احساس ہے۔کہ ان کی فکر محدود نہیں وسیع ہے۔

تجھے ہے فکر اپنے آشیاں کی
مرے پیش نظر سارا چمن ہے

ان کے نزدیک دنیاوی امارت کی بجائے انسان کا فکر وفن ہی اصل میں اس کی عزت وتکریم کا باعث ہے۔

فکر وفن کی ہو فراوانی تو اے دانشورو!
مفلسی بھی باعثِ توقیر ہونی چاہئے

اور فکر وفن کی یہ فراوانی ان کے یہاں عام ہے۔کہ وہ ایک حساس دل اور باشعور ذہن کے حامل ہیں۔قدم قدم پر معاشرتی نا انصافی' سیاسی ظلم وجبر اور اعلیٰ انسانی اقدار کی بے حرمتی پر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ان کی بصارت وبصیرت جہاں انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔وہاں ہمارے لئے بھی لمحۂ فکریہ مہا کرتی ہے۔مثلاً

شوق سے دستار بندی کیجئے میرے حضور!
سر بھی کیا قابل ہے؟ یہ تو پوچھیئے دستار سے

میں اسے باران رحمت اے خدا! کیسے لکھوں؟
مفلسی کچے مکاں اور بارشوں کا سلسلہ

نہیں عریاں مگر عریاں ہیں سارے
بدن پر کس طرح کا پیرہن ہے؟

حفاظت ہو رہی ہے ایسے گھر کی
جہاں باقی بچا کچھ بھی نہیں ہے

جہاں اک بھیڑ ہے چارہ گروں کی
وہاں کے لوگ ہیں لاچار کتنے

اس مایوس کن صورتحال کو ان کی حقیقت پسند طبیعت کچھ اس طرح بیان کرتی ہے کہ یکسانیت کی بجائے ان کے لہجے میں ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

دبدبہ تھا اس قدر سورج کا سارے شہر پر
چلچلاتی دھوپ کو بھی سائباں لکھا گیا

بجھتے بجھتے جل اٹھے اور جلتے جلتے بجھ گئے
رات کیا تارے مریض نیم جاں کے ساتھ تھے

شدت غم سے چوڑیاں ٹوٹیں
اور ہاتھوں میں ہے حنا گم صم

گرچہ موضوع روشنی ہے مگر
حاصل گفتگو اندھیرا ہے

ایک بھی پانی کا قطرہ دیکھئے ٹپکا نہیں
تھا اگرچہ آسماں پر بادلوں کا سلسلہ

تری تائید میں دنیا ہے ساری
ہمارا ہم نوا کوئی نہیں ہے

بشارت دے رہے تھے جو ثمر کی
وہی سارے شجر کاٹے گئے ہیں

وہیں موجود ہیں شہکار ان کے
جہاں دست ہنر کاٹے گئے ہیں

میں تو اپنے شہر میں ہوں اور ہوں محفوظ بھی
غیر آئے کس لئے کرنے نگہبانی مری

یہ حقیقت پسندی اصل میں ان کے زبردست سیاسی اور سماجی شعور کی دین ہے۔ جوان کے حساس قلب ونظر میں ہرآن زندہ ہے۔ یہیں وہ ایک نقاد کا فریضہ بھی انجام دیتے نظر آتے ہیں۔

غلط رکھی تھی میں نے خود بنائے آشیاں اپنی
مری بربادیوں میں خود مرا کردار شامل ہے

اجڑے گھر کی ویرانی پر شاد نہ ہو تو
تیرے گھر کا بھی یہ نقشہ ہو سکتا ہے

تیر جا کر پلٹ نہیں سکتا
سوچ کر تم کمان میں رکھنا

کر رہے ہیں جو چمن میں بادِ صرصر کو طلب
شاخ گل ان کے لئے شمشیر ہونی چاہئے

خواب دیکھا تھا بہت شفاف تر
ہے مگر تعبیر میں آلودگی

نہیں روکا اگر ان آندھیوں کو
تو مٹتے جائیں گے گلزار تیرے

چلن بدلا ہے اب کے دشمنوں نے
اب ان کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

جو آئے تھے مری چارہ گری کو
انہوں نے اور گھائل کر دیا ہے

ہوا کے آج کچھ تیور نئے ہیں
دئے جلنے سے پہلے بجھ رہے ہیں

یہاں ان کی مایوسی اور محرومی ایک ہمت افزا اور جرأت آفریں لہجے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

مرے قاتل کی اذیت کو یہی کافی ہے
شہر قاتل میں مرا سوگ منایا جائے

اور یوں وہ پھر ایک بار غم کے ذات کی طرف اس انداز سے متوجہ ہوتے ہیں کہ غم کے اس مرمریں پیکر پر غم دوراں کے پھیلتے ہوئے سائے بھی ہمیں صاف نظر آتے ہیں۔

تجھ کو آباد کریں دل میں یہی خواہش تھی
دل کو پایا ہی نہیں درد سے خالی ہم نے

سارے مجبوریوں کے سودے ہیں
کوئی یوں دربدر نہیں ہوتا

جو سوچوں تو تہہ و بالا ہے دنیا
جو دیکھوں تو ہوا کچھ بھی نہیں ہے

دل کسی اور کے اثر میں ہے
میں کسی اور کے اثر میں ہوں

یہ لوگ نہیں واقف اس دل کی تمازت سے
جب آگ نہیں اس میں اٹھتا ہے دھواں کیسے؟

گل کھلے ہیں جو آج صحرا میں
ان میں خوشبو مرے لہو کی ہے

لیکن بہاروں کا موسم بھی انہیں راس نہیں آتا۔

زخم میرے پھر ہرے ہونے لگے
میں بہاروں کا یہ موسم کیا کروں؟

چنانچہ ان کے لہو کی خوشبو انہیں بہار و خزاں سے تھک کر ایک تیسرے موسم کی طلب میں بیقرار رکھتی ہے اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

بشارت تیسرے موسم کی آئے
بہاروں سے خزاں سے تھک گیا ہوں

اور یوں بہار و خزاں سے ماوراان کی فکر پر تیسرا موسم طاری ہو جاتا ہے۔

مجھ پہ طاری ہے تیسرا موسم
میں خزاں میں نہ میں بہار میں ہوں

یہ تیسرا موسم اصل میں ان کے اندر کا موسم ہے۔جس میں بہار کا کچھ پرتو بھی ہے اور خزاں کا عکس بھی۔یعنی اجالے اندھیرے اور خوشی وغم کے درمیان ایک ایسا منظر جو زندگی کا اصل منظر ہے۔اس منظر کی کیفیت کو وہی لوگ زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں جو ظاہری بینائی رکھنے کے ساتھ ساتھ دل کی آنکھوں سے بھی حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی توفیق رکھتے ہوں اور طارق محمود طارق اپنی غزل کے آئینے میں جاگتی آنکھوں سے یہ دلکش نظارہ نہ صرف خود دیکھتے ہیں بلکہ روشنی کے اس سفر میں وہ قدم بہ قدم اپنے قارئین کو بھی شریک رکھتے ہیں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ان کی کامیابی ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کی شگفتہ بیانی

ڈاکٹر عابد معز ان اپنی شخصیت اور فن کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔وہ مزاجاً سنجیدہ اور طبعاً ایک وضعدار آدمی ہیں۔لیکن ان کی تحریر بناشت اور شگفتگی سے معمور ہے اور وہ ایک کامیاب مزاح نگار ہیں۔اگر چہ یہاں شگفتہ نثر کے میدان میں کئی اور شہسواروں کے نام بھی آتے ہیں۔مثلاً ابو الفرح ہمایوں، سید صفدر حسین، علیم خان فلکی، کبیر خان، مبز ادسحر، نذیر احمد فہمی، نجم الحسن رضوی اور یوسف مرزا رہبر، مگر ڈاکٹر عابد معز اس کارواں کے یوں قافلہ سالار ہیں کہ مقدار اور معیار کے لحاظ سے وہ سب میں نمایاں ہیں۔اگر چہ اب تک ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔مگر متعدد مسودے اشاعت کے منتظر ہیں۔اسی طرح وہ ایک عرصے سے مقامی اخبارات و جرائد میں مسلسل فکاہیہ کالم لکھ رہے ہیں۔جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔اس کے علاوہ جہاں وہ حیدر آباد (دکن) سے باقاعدہ شائع ہونے والے ماہنامے ''شگوفہ'' کے اوورسیز ایڈیٹر ہیں۔وہاں طنز و مزاح کے فروغ کے لئے مختلف ادبی تقاریب اور کانفرنسیں بھی منعقد کرتے رہتے ہیں۔ان کی انہی گراں قدر خدمات کے پیش نظر حال ہی میں حیدر آباد کی ایک یونیورسٹی سے ان کی شخصیت اور فن پر ایم فل کا مقالہ تحریر ہوا ہے اور اب ''شگوفہ'' کا عابد معز نمبر شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز ۱۹۵۵ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔پیشے کے اعتبار سے وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور ماہر تغذیہ و استحالی امراض کے طور پر ریاض (سعودی عرب) میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔''واہ حیدر آباد'' اور ''سگ گزیدہ'' ان کی ایسی تصانیف ہیں۔جو اہل ذوق میں قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

''واہ حیدر آباد واہ'' ایک ایسی منفرد کتاب ہے جو ایک ہی شہر (حیدر آباد) کے بارے میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔یہ مضامین ۸۳ء سے ۸۷ء کے درمیان ماہنامہ ''شگوفہ'' میں

''مرا شہر لوگاں سوں معمور کر'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئے تھے۔جو کتابی صورت میں آنے سے پہلے ہی قارئین میں مقبول ہو چکے تھے۔اس کتاب میں زیادہ تر متوسط طبقے کے مسائل کا اظہار ہے۔مضامین کی رنگارنگی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ شہر کی تہذیبی وسماجی زندگی کا شاید کوئی ایسا گوشہ ہو جو ان میں پیش نہ کیا گیا ہو۔مثلاً ''شہر اردو'' حیدرآباد کی خاص زبان کے بارے میں ہے۔تو ''چار منارے کا شہر'' میں حیدرآباد کی معروف تاریخی عمارت چار مینار کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح ہمارا ''شہر خوبصورت ہے''۔''قلتِ آب'' اور ''مجسمے ہی مجسمے'' میں حیدرآباد کے شہری مسائل کا بیان ہے۔جبکہ ''انتخاب کا موسم'' سیاسی مسائل اور ''باہر کا جادو'' اور ''پاشو باہر سے آیا'' معاشی مسائل پر شگفتہ تحریریں ہیں۔''چائے خانے'' اور ''ہمارے دواخانے'' سماجی مسائل تو ''بس بس'' ٹرانسپورٹ کی مشکلات کا احاطہ کرتے ہیں۔ایسے ہی ''پچھفتہ''۔''پھر وہی ہفتہ''۔''اٹھاون پچپن اور تیس تینتیس'' سرکاری ملازمین کے مسائل اور ''ناکردہ گناہوں کی سزا'' اور ''کرفیو اٹھ گیا'' فرقہ وارانہ فسادات پر لکھے گئے ہیں۔جبکہ ''جانوروں کی کانفرنس'' مفادات عامہ کے موضوع پر اور ''امتحان'' خالص تعلیم کے مسئلہ پر ایک فکاہیہ تحریر ہے۔

ان تمام مضامین میں حیدرآباد شہر کی سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو ایسے شکر آمیز (Sugar Coated) انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کہ پڑھنے والے کو کہیں کسی قسم کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا۔یہ اگرچہ حیدرآباد کا نثری شہر آشوب ہے۔اور اس میں شہر کے زیادہ تر منفی پہلوؤں کو ہی نمایاں کیا گیا ہے۔لیکن اس نفی میں بھی اثبات کا پہلو موجود ہے۔کہ پڑھنے والے کو شہر سے کہیں نفرت یا بیزاری کا احساس نہیں ہوتا۔بلکہ شہر کے مسائل سے آگہی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اور وہ اس فضا اور ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے۔ جو اس شہر کا خاصہ ہے۔ڈاکٹر صاحب کا مشاہدہ نہایت گہرا ہے۔اور نہایت باریک بینی سے انہوں نے مختلف مسائل کا جائزہ لیا ہے۔یوں کہا جاسکتا ہے۔کہ بطور ڈاکٹر اگرچہ انہوں نے معاشرے کی خرابیوں کی جراحی کی ہے۔لیکن بے رحمانہ انداز میں نہیں بلکہ سنجیدہ مسائل کو ہلکے پھلکے اور شگفتہ

انداز میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

آیئے ان کے اندازِ تحریر کا نمونہ دیکھنے کے لئے اس کتاب سے ان کے صرف دو اقتباس دیکھتے ہیں۔لفظوں کے ذریعے پیدا کی گئی مضحک صورتحال کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔

''باہر سے آئے ہوئے ایک نوجوان نے ایک عرب کا ہم سے تعارف کرایا۔آپ میرے آجر ہیں۔حیدرآباد کا نمکین حسن انہیں یہاں کھینچ لایا ہے۔کوئی خوبصورت اور نوجوان لڑکی آپ کی نظر میں ہو۔تو ان کا خیال رکھئے۔یہ ہمارے شہر میں پندرہ دن رہنے والے ہیں۔عرب سے مل کر ہمیں محسوس ہوا کہ وہ صرف ہمارے شہر میں ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی پندرہ دن کے مہمان ہیں''۔(باشو باہر سے آیا)

منفی صورتحال میں مثبت پہلو تلاش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''بس اسٹاپ پر نہیں ٹھہرتی' آگے یا پیچھے رکتی ہے۔مسافرین بس میں سوار ہونے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔جیسے ہی مسافر بس کے قریب پہنچتے ہیں۔بس ان سے دور جانے کے لئے چل پڑتی ہے۔اسی بھاگ دوڑ میں مسافر کی منزل آجاتی ہے۔ٹکٹ کے پیسے بچنے کے ساتھ ورزش بھی ہوجاتی ہے''۔(بس بس)

ان کی دوسری کتاب ''سگ گزیدہ'' ہے۔جو ان کے سولہ مضامین پر مشتمل ہے۔جو مختلف موضوعات پر ہیں۔یہ مضامین طنز و مزاح اور ظرافت و شگفتگی کے دھنک رنگوں سے معمور ہیں۔ مطالعے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کا مشاہدہ بھی عمیق اور وسیع ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں ایک ندرت اور تنوع ہے۔ان کے مزاح کا مزاج عام طور پر ایک نئی نویلی دلہن کی طرح شرمیلا شرمیلا سا ہے۔اور پڑھنے والے کو زوردار قہقہے کی بجائے صرف زیرلب مسکرانے پر مجبور کردیتا ہے۔ان کی تحریر میں روانی اور شگفتگی ہے۔اس کے علاوہ بے ساختگی اور تہہ داری بھی اس کی خصوصیت ہے۔پھر خالص حیدرآبادی لب و لہجے کی شیرینی اس سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔وہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات لطیفوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔اسی طرح ان کے یہاں کہیں لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش ہے۔تو کہیں صورتحال کو مضحک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کچھ نمونے دیکھئے۔

''انگریزی فلموں میں نظر سب آتا ہے۔لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آتا''

(فلمی پلاننگ)

''لائبریری میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہوتی۔جو گھر کے ماحول سے گھبرا کر لائبریری کا سکون برباد کرنے چلے آتے ہیں۔وہ بے مقصد ادھر ادھر کتابیں الٹ پلٹ کرتے پھرتے ہیں''۔

(لائبریری کی سیر)

''میں نے اپنی بپتا دفتر والوں کو سنائی۔کہ رات چوہوں نے سونے نہ دیا۔سو رخصت لے کر ''قضا نیند' پوری کر رہا ہوں''۔

(کالے کالے دانے)

''چند روز قبل ہم نے ایک جوڑے کو شاپنگ کرتے دیکھا۔اور دیکھتے رہ گئے۔شوہر کے اطراف بچوں اور تھیلیوں کا ہجوم تھا۔بال الجھے ہوئے تھے۔اور پتلون بار بار نیچے ہوا جاتا تھا جسے رانگیر اوپر کر دیتے تھے''۔

(گھونگھٹ اٹھنے سے پہلے)

اور اسی مضمون میں ایک اور جگہ شگفتہ صورتحال کچھ یوں ہے۔

''ایک صاحب جوتوں کی دکان پر بھاگے بھاگے آئے۔ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔بھائی! میری بیوی کے لئے سینڈل چاہئے۔ہلکی ایڑی والے۔ناپ لانا بھول گیا ہوں۔شاید وہ میرے پیچھے آ رہی ہوگی۔چند منٹ بعد کچھ یاد آنے پر چونک کر کہا۔ٹھہریئے! میری پیٹھ پر اس کے جوتے کا سائز موجود ہے''۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔کہ ڈاکٹر عابد معز کے فن میں شگفتگی اور بے ساختگی کے وہ سب لوازم کسی نہ کسی انداز میں موجود ہیں۔جو ایک کامیاب مزاح نگار کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ان کے کالموں میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود دلچسپی کا عنصر ان میں سب سے زیادہ ہے۔ڈاکٹر صاحب کا فنی سفر تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ان کے بے شمار مضامین اور کالم ابھی یکجا ہو کر منظر عام پر نہیں آئے۔جب وہ کتابی شکل میں شائع ہوں گے تو جہاں اردو کے فکاہی ادب کا خزانہ مالا مال ہوگا۔وہاں ان کے فن کے مختلف گوشے بھی روشن ہو کر ناقدینِ ادب کے سامنے آئیں گے۔اور اس طرح ان کی صحیح قدر و قیمت کا حق ادا ہو سکے گا۔

ابوالامتیاز۔ع۔س۔مسلم بحیثیت شاعر

عہدِ موجود میں جناب ابوالامتیاز۔ع۔س۔مسلم کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں' وہ ایک سچے پاکستانی اور پکے مسلمان ہیں اگرچہ علمی و ادبی ماحول میں ان کا نام ایک ممتاز ادیب' شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانا پہچانا ہے لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت سب سے نمایاں ہے۔اب تک بیس بائیس کے قریب ان کی شعری تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ان کی عہد ساز شخصیت اور ہمہ گیر فن پر معروف ناقدین نے متعدد مقالے تحریر کئے ہیں جو مختلف کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ حال ہی میں ان کے بارے میں بھارت کی ایک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔اسی طرح مصر میں ان کی تصنیف ''کاروانِ حرم'' کا عربی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے جو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کا بین ثبوت ہے۔

بحیثیت شاعر مسلم صاحب کی کئی تخلیقی جہتیں ہیں۔نظم و غزل ہو یا گیت اور دوہے حمد و نعت ہو یا بچوں کی نظمیں انہوں نے تقریباً ہر معروف صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔اس مقالے میں ہم ان کی انہی جہتوں کا فکری اور فنی جائزہ لیں گے۔وہ تین زبانوں یعنی اردو' پنجابی اور انگریزی میں شعر کہتے ہیں۔

سب سے پہلے اردو میں ان کی شاعری اور اس میں نظم و غزل ہمارا موضوعِ بیان ہوگی۔

نظم و غزل میں ان کے مجموعے ہیں ''اوس اور کرنیں''۔''برگِ تر'' اور ''دینش گل'' ''اوس اور کرنیں'' میں غزلیں نظمیں اور گیت ہیں جبکہ ''برگِ تر'' میں نظمیں گیت اور دوہے اور ''دینش گل'' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

نظم سے انہیں دلی لگاؤ ہے اور وہ بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر ہیں۔ان کی نظمیں زیادہ تر پابند نظم کی ہیئت میں ہیں۔ان کی نظموں میں عالمی تناظر کے دوش بدوش پاکستان کا تاریخی' تہذیبی'

سیاسی اور سماجی پس منظر واضح نظر آتا ہے۔ وطنِ عزیز کے معاملات و مسائل ان کی توجہ کا خاص مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں ثبات، اطمینان، قرار اور استقلال نمایاں ہیں۔ انہیں جہاں جدید زندگی کے مسائل و مباحث کا ادراک ہے وہاں وہ عہدِ رواں کے سیاسی و سماجی اور تہذیبی تقاضوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان مسائل و معاملات کا معروضی انداز میں سماجی اور نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ان کی قومی و ملی نظموں میں ایک فکری استحکام اور فنی اثبات ملتا ہے۔ عظمتِ ماضی کے عرفان و احساس کے ساتھ ساتھ حال کے ادراک اور مستقبل کی امنگیں اور ترنگیں ان کی نظموں کے مرغزار میں غزالوں کی طرح رقصاں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک راست باز پختہ فکر اور صاحبِ نظر شاعر ہیں۔ جو نوعِ انسان سے پیار کرنے کے علاوہ اپنے وطن کی عظمت کے گیت بھی گاتے ہیں۔

کھل اٹھا صحنِ تصور میں گلستانِ بہار
نکہتِ گل کی طرح مہکا گئی چودہ اگست
دُھل گیا ذہن غلامی سے اندھیروں کا غبار
کوثر و تسنیم میں نہلا گئی چودہ اگست
لہلہا اٹھے خیالوں میں ہرے شاداب کھیت
سبز پرچم کی ردا لہرا گئی چودہ اگست

(چودہ اگست)

بارانِ رنگ و نور ہے میرا وطن مجھے
جنت سے بھی حسین ہیں اس کے چمن مجھے
سینچا ہے جس سے قوم نے اس کشت زار کو
وہ خوں دکھائی دیتا ہے پھر موجزن مجھے

(میرا وطن)

مسلم کی پسندیدہ قومی و ملی شخصیت بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت ہے جو گلشن مسلم کے باغبان، ملت کے ترجمان وحدت کے پاسباں، میر کاروں اور فتح کا نشان بن کر ظاہر ہوئی اور یہی شخصیت حوصلہ و ہمت اور عزم و ثبات کی جیتی جاگتی علامت کے طور پر ہمارے قومی افق پر ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

روشن تھے اس کی آنکھ میں منزل کے پیچ و خم
وہ میر کارواں تھے محمد علی جناح

ہم بھول جاتے ہیں کہ وطن عزیز کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مسلم کے یہاں یہ درد دیکھئے

قفس کہہ کر اسے اب مت اجاڑو
بڑی مشکل سے اپنا گھر بنا ہے

نظموں میں مسلم صاحب کا لہجہ قنوطی کی بجائے رجائی ہے اور وہ زندگی کی محرومیوں، سنگینیوں اور سختیوں سے زیادہ اس کی مسرتوں اور لطافتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

بازو اگر تھکے ہوں کب پار ہو سفینہ
بام عروج کا ہے جہد و یقیں ہی زینہ
سعی و عمل سے عاری جینا ہے کوئی جینا
اس کو پڑا ہمیشہ زہرِ شکست پینا
جس نے کبھی مشقت کوئی نہیں ہے جھیلی

(پیامِ عمل)

ان کے یہاں مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کا گہرا مشاہدہ بھی ملتا ہے اور مطالعہ بھی، مثلاً وہ انسان اور فطرت کے کھوئے ہوئے رشتے کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں اور یوں ان کی شاعری زندگی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے فطرت کو فقط آئینہ ہی نہیں دکھاتی بلکہ زندگی کو پر معنی و پر عظمت شکل میں رنگ و نور سے مزین بھی کرتی ہے مثلاً

معطر معطر لب جوئے بار
معنبر معنبر بہارِ کنار
مطہر مطہر نفس مشکبار
مصور مصور شجر کی قطار
مشجر مشجر ہے رنگِ بہار
منور منور ہیں لیل و نہار
ہے آئینہ آئینہ ہر موئے تن
معطر معطر شرابِ بدن

(جوئبار)

قدم قدم ہے مرغزار
نفس نفس ہے مشکبار
نسیم صبح عطر بار
مچلتی مے کی جوئبار
کنار وا ہے کوہسار
بہک چلا ہے آبشار
نظر نظر شراب ہے
ہر ایک فیض یاب ہے

(ارض مہوشاں)

چٹک رہی تھی چاندنی
چھٹک رہی تھی چاندنی
بھٹک رہی تھی چاندنی
بہک رہی تھی چاندنی

دمک رہی تھی چاندنی
مہک رہی تھی چاندنی
نشاطِ حسن و مے کی رات
طلسم لیلِ معجزات

(طلسم لیل معجزات)

ان نظموں میں بلا کی روانی، نغمگی اور زبان پر قدرت نظر آتی ہے جو ان کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ مسلم کی شاعری کا عمومی مزاج حسن، خیر اور صداقت کی عظیم اقدار سے عبارت ہے۔ اس کے وسیلے سے وہ اعلیٰ اخلاق، ایمان، شرافت اور وضعداری کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی دورِ حاضر کے انسانوں کے تمام تر روحانی عوارض کا علاج ہے اور حمد و نعت کی طرف ان کا رجحان بھی اسی منشور کا حصہ ہے۔

مسلم نے اپنے گیتوں اور دوہوں میں معاشرتی زندگی کے ان مناظر کی عکاسی کی ہے جن سے ان کا ہمیشہ کا تعلق ہے۔ ان کے نغموں میں ہندی کے کومل الفاظ کی آمیزش سے ایک تازگی سی نظر آتی ہے۔ ان کے گیت ایک والہانہ ترنگ اور دردمند دل کی پکار ہیں۔ ان کی زبان سیدھی سادی اور آسان ہے جو براہ راست دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔

پت جھڑ کے سوکھے سوکھے رُکھ
جیسے ساجھ کریں میرا دکھ
اوس بھی ساتھ میں نیر بہائے
پت جھڑ مورے من کو بھائے

.....

جیون کے اس اندھیارے میں
کون جو دیپ جلائے

یہ کلجگ ہے کیسا پیارے
سارے آج پرائے
سایہ تک بھی ساتھ نہ آئے
سکھ آئے سکھ جائے

اسی طرح دوہے کی مثال ہے۔

دل کے اندر کھوٹ بھرا ہے، لب پر میٹھے بول
کلجگ کی یاری ہے مسلم جیسے ڈھول کا پول

"شیشِ گل"، مسلم صاحب کی صرف غزلوں کا مجموعہ ہے جس کا منظوم انتساب شاعر نے اپنی جیون ساتھی کے نام کیا ہے۔ جس میں مسلم صاحب نے اپنی رفیقہ حیات کو محبوب کا درجہ دے دیا ہے۔

مری جانِ جاں مری زندگی تو مری مزاج شناس بھی
تو نشانِ منزلِ دل مری تو ہی قصرِ جاں کی اساس بھی
تو شریکِ راحت و غم مری تو جمالِ پیکر دلبری
تو بہارِ گلشنِ زندگی تو ہی پھول ہے تو ہی باس بھی
تو یونہی شریکِ سفر رہے کوئی حزن ہو نہ حذر رہے
کبھی زیرِ مجھ کو نہ کر سکے غم و رنج و خوف و ہراس بھی

مسلم صاحب کی غزل میں روحانیت بھی ہے اور رومانیت بھی اور یوں اس میں شائستگی اور شستگی نے پاکیزگی کی فضا برقرار رکھی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی ہر آن بدلتی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماج کے داخلی تضادات کا بیان بھی ہے اور زندگی کے حقائق کی نیرنگی کا مشاہدہ بھی جس کا اظہار بے ساختہ ہے۔ مثلاً

کیسی بے چینی قفس میں آج دیوانے کو ہے
جھانک کر دیکھو چمن میں کیا بہار آنے کو ہے؟

رنگ جس کا یہ ارغوانی ہے
جانے کیسی ندی کا پانی ہے

جی جان کی سلگن سے تو جل اٹھنا ہی اچھا
جن پتوں پہ تکیہ ہے ہوا کیوں نہیں دیتے ؟

اسیری میں پرندے اپنے جوہر بھول جاتے ہیں
ہنر پرواز کے شہزور شہپر بھول جاتے ہیں

جانے منزل پہ کیوں نہیں پہنچا
رہ گزر میں ہے کارواں کب سے

ان کا نظریۂ فن اس ایک شعر سے ظاہر ہے۔

لفظ عکسِ خون دل
رنگ سے پیدا ہے رنگ

رنگ سے رنگ پیدا کرتے ہوئے ان کے فن نے جو مرقعے تخلیق کیے ہیں وہ امید و بیم، رنج و راحت، ہجر و وصال، فتح و شکست، نشیب و فراز، بہار و خزاں اور نور و ظلمت کی کیفیات کے آئینہ دار ہیں۔

کہیں انداز عارفانہ ہے۔

اگر وہ اپنے کرم سے بخشے مجھے نگاہِ قلندرانہ
نکال لاؤں ضمیر الفاظ کی صدف سے دُرِ یگانہ

کہیں لہجے کا بانکپن ہے۔

یہ نقاب غنچہ و گل کس لئے
جلوۂ رخ آشکارا چاہیئے

اور کہیں خالص رنگِ تغزل

جلوۂ بے اختیارِ حسن پابندِ حیا
ان کا آنا سامنے بے ساختہ چلمن سمیت

مسلم کے یہاں خالص ادبی زبان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بول چال کی زبان بھی ملتی ہے۔جس نے ابلاغ میں ایک حیرت انگیز آسانی پیدا کر دی ہے۔

حقیقت تھی فسوں تھا واہمہ تھا یا فسانہ تھا
سرابوں کے سفر میں منتشر ہر تانا بانا تھا

ہمیشہ برق گرتی دیکھتے آئے تھے سب لیکن
ہمارا بھی جلے گا آشیاں کس نے یہ مانا تھا

مسلم کی کچھ غزلوں میں فکرِ اقبال کی روشنی بھی جھلکتی ہے۔مثلاً

کاروانِ کن فکاں ہر دم رواں
لمحۂ تعمیر میں ہے ہر جہاں

خرد لحظہ بہ لحظہ پابجولاں
جنوں کا لحہ لحہ بے کراں ہے

حرصِ طلب سے بچ نہ سکی عصمتِ خودی
ہر شخص اس کی بزم میں رسوا دکھائی دے

اسی طرح مسلم کی غزل میں حسرت کی روایت کے زیرِ اثر خالص رنگ تغزل کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مثلاً

چشم و ابرو کے اشارات سے آگے نہ بڑھی
گفتگو حرف و حکایات سے آگے نہ بڑھی

ہائے وہ لفظ کہ منت کشِ معنی نہ ہوا
ہائے وہ بات کہ جو بات سے آگے نہ بڑھی

اور اب مسلم کا اپنا رنگِ تغزل دیکھئے۔

نظر نظر میں جو تجھ کو سجائے پھرتے ہیں
انہی کی بزم میں رخ پر نقاب کیا رکھنا

حالِ دل پھر پوچھنے آئے ہیں وہ
حالتِ دل پھر عجب ہونے لگی

وہ مسکرا دیئے تو کھلی دل میں چاندنی
بدلی نظر تو آنکھ سے برسات ہو گئی

سیر گل ختم ہوئی خاک بسر جاتے ہیں
شام ڈھل جائے تو سب لوٹ کے گھر آتے ہیں

ہوئیں تاریک راتیں پھر خیال یار سے روشن
شب یلدائے غم بھی چاندنی اوڑھے ہوئے آئی

زبان وبیان، فکروخیال اورجذب واحساس کی یکجائی مسلم صاحب کی غزل کی خوبی ہے۔

مثلاً

دیارِ عشق میں خُو سرابِ جستجو رہنا
نشاطِ آبلہ پائی میں میرا کو بہ کو رہنا

اور

اشک آنکھوں میں بھر گئے ہوں گے
ہم سے مل کر جو گھر گئے ہوں گے

مسلم زندگی کے عمیق مشاہدے اوروسیع تجربے سے اظہار کے ایسے خوبصورت پیکرتراشتے ہیں جن میں ہماری کلاسیکی غزل کا ترفع بھی ہے اورموضوعات کا تنوع بھی۔مثلاً

کمال عشق کی تاثیر مسلم یہ سمجھتے ہیں
کہ خواہ کر ہمارے پاس ان کی انجمن آئے

مختصر سی بات تھی اور سوچئے تو کچھ نہ تھی
میرے لفظوں کو معانی اس نے پہنائے بہت

اورفلسفۂ تخلیق

قطرۂ اشک کو بھی رشک گہر کر نہ سکا
نالۂ نیم شبی کسبِ ہنر کر نہ سکا

الغرض مسلم صاحب کی غزلوں میں زندگی کی ہمہ رنگ کیفیات ہیں جن میں موضوعات کی

ندرت بھی ہےاوراظہار کی قدرت بھی۔

آنکھ دھند لائی رہی اشکِ رواں سے مسلم
تھا میسر ترا دیدار مگر کر نہ سکا

تری خوشبو کے پیراہن سے غنچوں نے مہک پائی
تری زلفوں سے سیکھا ہے گلوں نے مشکبو رہنا

کس طرح کہئے چمن کو حسن کا آئینہ دار
سامنے اس شعلہ رو کے پھول کملائے بہت

بھولنا ان کو ہے ممکن یہ بھی اپنی بھول تھی
جب بھی دیکھا آئنہ مسلم وہ یاد آئے بہت

اوراب آتے ہیں ان کی حمدیہ اورنعتیہ شاعری کی طرف۔نظم وغزل کے تین مجموعوں کے مقابلے میں ان کی حمد ونعت کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو یہ ہیں۔حمد ونعت، اللہ ورسولؐ کعبہ وطیبہ، زمزمہ سلام، زمزمہ درود، کاروانِ حرم، حمد باری اورزبورِنعت اوران سے ظاہر ہوتا ہے کہ منظومات اوراشعار کی مقدار کے لحاظ سے بھی ان کی حمدیہ ونعتیہ شاعری کا پلڑا زیادہ بھاری نظر آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اب ان کی ادبی پہچان حمد ونعت کے حوالے ہی سے زیادہ ہے۔وہ حمد ونعت کے ایسے نمایاں شاعر ہیں جن کا عصر حاضر کی حمدیہ ونعتیہ شاعری میں ایک خاص مقام ہے۔

کاروانِ حرم، جسے مثمن مسلم بھی کہا جا سکتا ہے۔دراصل حرمین شریفین یعنی مکہ معظمہ اورمدینہ منورہ کے سفرمقدس کی ایک منظوم روداد ہے جسے شاعر نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تحریر کیا ہے۔اسے حج بیت اللہ کا جسمانی اورروحانی سفرنامہ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک

مسلسل نعت ہے اور قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کے مستند حوالوں نے اسے اور معتبر بنا دیا ہے۔اس طرح یہ فکر انگیز وقیع اور رفیع اسلوب کی حامل ایک تاریخی نظم ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ ایک مستند تحقیقی وعلمی کارنامہ بھی ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ نظم علم وعقیدت۔آگہی وشیفتگی اور قادر الکلامی وبے ساختگی کا بے مثل شہکار ہے۔اس کے لئے فارسی کی معروف نظم کریما کی رواں دواں اور پراثر بحر کا انتخاب کیا گیا ہے اور یہ مثمن کی شکل میں ہے۔

یہ سفرنامہ دراصل ان کے مشاہدات وواردات قلبی کی روح پرور داستان ہے جسے انہوں نے اپنے تاریخی شعور اور سچی عقیدت سے مربوط کیا ہے۔ان کے بیان میں ایک سرشاری وسرمستی کی کیفیت ہے۔نظم کے مختلف حصے ہیں سب سے پہلے شاعر صدق دل سے اپنی خطاؤں کا اعتراف اوران پر ندامت کا اظہار کرتا ہے۔اس کے بعد رب العالمین کی حمد وثنا ہے اور آخر میں اپنی اور پوری امت مسلمہ کی جانب سے دعائے نجات اور طلب مغفرت ہے۔گویا کاروان حرم حمد و مناجات۔نعت وسلام توجہ واستغفار اور دعا وفریاد کا ایک سدا بہار گلدستہ ہے۔آغاز کا انداز دیکھئے۔

چلا ہے حرم کی طرف کارواں — یہ انبوہ عشاقِ دل خستگاں
صف عاصیاں لشکر مجرماں — سروں پر گناہوں کا بارِ گراں
بدامن تہی بادلِ خونچکاں — جگر موج خوں چشم جوئے رواں
حرم ہے کہ محشر کا میدان ہے — مرا منہ ہے میرا گریبان ہے

شاعر خالق ازل کی بارگاہ میں محض اپنے لئے ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے امن و آشتی اور خیر وبرکت کی دعا کرتا ہے۔

ترے باب عالی پہ سائل ہیں ہم — ذلیل و خجل خوار و بد حال و خم
مٹا دے دلوں سے زمانے کے غم — گرا دے جو سر پر ہے بار الم
بچا فتنہ دہر سے دم بدم — بہ رحمت ہو بارانِ لطف و کرم
کریما بہ بخشائے بر حال ما — کہ ہستم اسیر کمند ہوا

پھر عاجزی وانکساری اور احساس بندگی کے ساتھ حمد باری تعالیٰ کا اثر انگیز بیان ہے۔

ترے واسطے ساری حمد و ثنا — نہیں کوئی معبود تیرے سوا
ہمیشہ سے تو ہے تجھی کو بقا — تجھی سے ہے نعمت تجھی سے عطا
بہر رنگ ہے تیرا ہی تذکرہ — تجھی کو ہے ہر ایک سجدہ روا
تو مالک ہے مولا ہے حاضر ہیں ہم — تو ہی رب ہے داتا ہے حاضر ہیں ہم

اس کے بعد ہجرت نبوی کا عہد آفرین واقعہ سامنے آتا ہے۔

محمدؐ کا اپنے وطن سے سفر — ہوا شمع کا انجمن سے سفر
کہ خوشبو کا ٹھہرا چمن سے سفر — سخن کا حریم دہن سے سفر
نفس کا ہے حبسِ بدن سے سفر — کہ دھڑکن کا قلب زمن سے سفر
جو مکہ تھا دنیا میں سب سے عزیز — محمدؐ کی کھوئی ہے اس نے تمیز

یہاں شاعر سفر کا ایک ایسا فلسفہ پیش کرتا ہے جو بیکراں اور مسلسل حرکت سے عبارت ہے۔

سفر ہے تغیر حضر ہے جمود — دل سنگ میں اک شرر کی نمود
سفر سے ہے روشن چراغ شہود — مسلسل سفر کاروان وجود
سفر بے نیاز حدود و قیود — سفر زیست میں ارتقا کا عمود
سفر زندگی ہے سفر ہے حیات — دما دم رواں ہے دم کائنات

اس طویل نظم کے اشعار کی تعداد ۱۰۰۵ ہے اور اس میں کل ۸۱۷ حوالے دیئے گئے ہیں۔اور ان میں سے ۸۰ فیصد قرآن حکیم سے ہیں۔باقی کتب احادیث وسیرت سے لئے گئے ہیں۔فنی لحاظ سے مسلم ایک پختہ کار شاعر ہیں۔جنہیں زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔مدحت خیر الانامؐ کے چند اشعار دیکھئے۔

محمدؐ کہ ہے افضل الانبیاء — محمدؐ امام سر اولیاء
محمدؐ چراغ دل از کیا — محمد پر عظمت اصفیا

محمدؐ ردائے سرِ اتقیاء وہی مصطفیٰ خاتم الانبیاء
وہ بدر الدجیٰ ہے مرا رہنما وہ شمس الضحیٰ ہے مرا رہنما

کوئی صفت ان کے یہاں سند کے بغیر نہیں۔ یوں ان کی قوت تخلیق کے ساتھ ساتھ ان کے ذوق تحقیق کی بھی داد دینی چاہئے۔ جہاں ان کے موضوعات میں وسعت ہے وہاں لفظیات میں بھی تنوع ہے۔ عربی، فارسی، پنجابی اور ہندی کے الفاظ وہ بڑی بے ساختگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مسلم صاحب نے اپنی اس معرکہ آرا نظم کا دیباچہ بھی خود لکھا ہے جو اپنی جگہ ایک شہکار ہے۔

نظم کے آخر میں ان کا ایک دعائیہ بند دیکھئے۔ جس میں پوری ملت اسلامیہ ان کے ہمنوا و ہم زباں محسوس ہوتی ہے۔

رضا کا ہمیں اپنی ادراک دے فغان شب و چشم نمناک دے
نگاہِ رسا فکر ادراک دے خیالات عالی دل پاک دے
لب صادق و قلب بے باک دے درِ رحمت شاہِ لولاک دے
محبت میں تیری رہے انہماک کہ ہو عاقبت روشن و تابناک

حمد باری میں مسلم صاحب کی کہی ہوئی اکثر حمدیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے حمدیہ کلام میں بائیس بحریں استعمال کی ہیں جو اکثر اپنے موضوع کی کیفیت سے ہم آہنگ ہیں۔ مثلاً عجز و انکسار اور خشیت کے احساس کی کیفیت اس شعر میں دیکھئے۔

الٰہی تجھی سے ہے میری پکار بہت ہے گراں سر پہ عصیاں کا بار

حمد میں غزل کا رمز و ایما کتنا پر کیف ہے۔

مجھ کو بطور عکس بھی ثانی نہیں قبول یوں میں نے لوحِ شیشۂ دل چور چور کی

حالات حاضرہ کا درد جب حمدیہ آہنگ میں شامل ہوتا ہے تو کتنا پر اثر محسوس ہوتا ہے۔

ہو خاص ترا لطف نظر میرے وطن پر اس مسکن اسلام پہ ہوں خاص عنایات
پھر میرے چمن میں ہو فضا امن و امان کی مومن ہے مہیمن ہے محافظ ہے تری ذات

زبور نعت کے نام سے مسلم صاحب کی نعتیہ شاعری کا انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ معیار اور مقدار یعنی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے یہ مجموعہ نعت عہد حاضر کے نعت کے دیگر مجموعوں میں ممتاز و منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ وہ صفت جو مسلم صاحب کو دوسرے نعت نویسوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی نعت کا علمی انداز اور اس کا مبسوط حوالہ جاتی نظام ہے۔ یہ حوالے بیشتر قرآن و حدیث اور تاریخ و سیرت سے ماخوذ ہیں۔ مختلف مقامات پر قرآنی آیات کے خوبصورت تراجم بھی قابل داد ہیں۔ اس طرح مسلم صاحب نے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر سینکڑوں اسمائے مبارکہ سے سرکار دو عالم کو یاد کیا ہے۔ یہ نام یا تو قرآن و حدیث سے لئے گئے ہیں یا تشبیہ و استعارہ کے انداز میں انہوں نے خود وضع کئے ہیں۔ ان کے دعائیہ انداز میں انفرادی ہی نہیں اجتماعی قرینہ بھی ہے کہ عام قاری بھی اس میں خود کو پوری طرح شریک محسوس کرتا ہے۔ مثلاً

یا محمد مصطفیٰؐ چشم کرم فرمائیے دل کو گھر کر لیجئے آنکھوں میں رچ بس جائیے

دنیا میں میسر ہو اطاعت شہِ دیں کی عقبیٰ میں ملے قربتِ سرکارِ محمدؐ

مسلم کی نعتوں میں شیفتگی و وارفتگی کا جوہر خوب جھلکتا ہے۔

مقدر ہو ایمان و دل کی حرارت تو پھر نعت کہیے
نظر میں ہو خیر البشر کی زیارت تو پھر نعت کہیے

محبوب رب ہے جو وہی میرا حبیب ہے
ہم ذوق ذوالجلال ہوں شہر نبی میں ہوں

روضۃ الجنت میں تاباں ہے وہ اک صحرا کا پھول
سینکڑوں گلشن بداماں ہے وہ اک صحرا کا پھول

سکون دل کا خزانہ جہاں سے ملتا ہے
چلو مدینے کہ سب کچھ وہاں سے ملتا ہے

جو مانگنا ہے اسی در سے مانگ لے مسلم
خدا کے بعد اسی آستاں سے ملتا ہے

نعت کے لئے گداز قلب اور قدرت قلم دونوں درکار ہیں۔ مسلم کو یہ دونوں صفات حاصل ہیں۔

پیدا ہوئی ہے صورت دیدار مصطفیٰؐ ہر ہر نفس کے ساتھ ہے ان پر مرا سلام

مسلم ایک سچے عاشق رسول ہیں۔ عشق رسول ان کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔ ان کی نعت کو ہم ان کا الہام بھی کہہ سکتے ہیں جو عقیدت کی چاشنی سے معمور ہے۔ مثلاً

رفعتِ شان محمد کا یہ ادنیٰ سا نشاں نقش پائے کہکشاں ہر رہگزر ہوتی گئی
زندگی کی شب سحر ہوتی نہیں آپؐ کی جب تک نظر ہوتی نہیں
میں خاک پائے سروریں چھوڑ کر کبھی ہرگز نہ لوں اگر کوئی مجھ کو خدائی دے

مسلم کی نعت میں صداقت کے ساتھ جوش اور جوش کے ساتھ ہوش بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الوہیت اور نبوت کی حدود میں فرق و امتیاز رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ سرکار کائنات کی ذات گرامی میں نبوت و عبدیت دونوں کے کمالات کا مکمل اظہار ہے۔ مسلم صاحب کو قدرت نے دل کی مستی کے ساتھ دماغ کی بیداری بھی عطا کی ہے۔ اسی لئے جوش محبت سے سرشار ہونے کے باوجود وہ افراط و تفریط سے بہت حد تک محفوظ رہے ہیں۔ وہ فرق مراتب سے آشنا ہیں۔ یعنی عبد و معبود اور خالق و مخلوق کی حدود سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز سخن محتاط ہے۔

امی لقب رسول کے فیضان علم سے دروازہ ہائے دانش و علم و ادب کھلے

زمزمہ سلام اور زمزمہ درود کے نام سے مسلم صاحب کے دو الگ الگ مجموعے ہیں جن میں حضور پرنورؐ پر درود و سلام شامل ہیں۔

اگر چہ جو مضامین عام طور پر نعت میں بیان ہوتے ہیں تقریباً وہی سلام اور درود میں بھی آسکتے ہیں۔ مگر ایک لحاظ سے یہ نعت سے ایک درجہ آگے کی چیز ہے کہ اس میں عشق رسول کے بیان کے ساتھ حضورؐ پر درود و سلام کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ مسلم صاحب نعت رسولؐ کے سلسلے میں ساری نزاکتوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے درود و سلام میں بھی اس احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔ چند نمونے دیکھئے۔

سلام ان پر کہ جو دل خستگاں کے چارہ گر ہیں
وہی حرف دعا ہیں اور وہی موج اثر ہیں
سلام ان پر جو ہیں رمز عبودیت کے جوہر
ہوئی خاک عرب نقش قدم سے جن کے گوہر
سلام ان پر جو پیغام ہدیٰ کے پاسباں ہیں
وسیلہ جو ہمارے اور خدا کے درمیاں ہیں
سلام ان پر جنہیں بعد خدا دل نے پکارا
وہی تھا میں گے مسلم ہاتھ محشر میں ہمارا
سلام ان پر جنہوں نے خواب غفلت سے جگایا
شب دل میں دیا نور صداقت کا جلایا
سلام ان پر بڑھی انسان کی جن سے قدر و قیمت
کھلی ہے قدسیوں پر ابن آدم کی حقیقت
سلام ان پر کہ جن کی یاد بستان ارم ہے
علاج قلب آشفتہ ہے درمان الم ہے

زمزمہ درود میں سیرت نگاری کی مثالیں مسلم صاحب کے یہاں عام ہیں۔ مثلاً

جہان نبوت کا وہ آفتاب
بڑھی جس سے سارے رسولوں کی تاب
وہ پیغام حق نور ام الکتاب
محمدؐ سے کون و مکاں فیضیاب
اسی سے ہدایت کا ہوا کتاب
نہ کوہ و جبل کو ہوئی جس کی تاب
لیا اس کو قلب محمدؐ نے تھام
محمد پہ لاکھوں درود و سلام

ایک اور انداز دیکھئے۔

فرش سے تا سر فلک
آپؐ کے ذکر کی مہک
خلق وخدا کی اک صدا
صلی علی محمدؐ

اور اب الف سے لے کری تک ان کے ردیف وار سلاموں میں سے چند مصرع ہائے اولی نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔اس سے شاعر کے بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار کے تنوع کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

سلام ان پر کہ جن کے ذکر میں دل کی شفا
سلام ان پر ہے شمع رہگور جن کی حدیث
سلام ان پر مجسم نور ہے جن کا وجود
سلام ان پر ہے جن کا ذکر تکمیل نماز
سلام ان پر ہے جن کی آسمان تک دسترس

سلام ان پر ہیں جن کی مدح میں عاجز حروف
سلام ان پر ہے بحر بیکراں جن کا کرم
سلام ان پر جو ہیں دونوں جہاں کی آرزو
سلام ان پر ہے جن سے آب وتاب زندگی

مختصر یہ کہ کاروان حرم سے لے کر زمزمہ دور تک ابو الامتیاز ع۔س' مسلم کی حمدیہ نعتیہ شاعری کا اگر اختصار سے بھی جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں حمد ہو یا نعت سلام ہو یا درود مسلم صاحب کی شاعری میں خلوص وعقیدت کے روح پرور جذبے کے ساتھ ساتھ ایک مثبت اور تعمیری فکر رواں دواں ہے جو سیرت پاک کے گہرے مطالعے کا اثر ہے۔وہ عہد موجود کے ان چند صاحب امتیاز اور صاحب اسلوب شعرا میں شامل ہیں جو علمی انداز کی نعت کہتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں ان کے یہاں حضورؐ کی سیرت طیبہ اور اسلام کے پیغام ہدایت کی اشاعت ایک مقصد کی طرح کارفرما ہے۔یوں فکری اور فنی لحاظ سے مسلم دور حاضر کے چند اہم حمد نگار اور نعت گو شعرا کی صف میں شامل ہی نہیں بلکہ کئی اعتبار سے ان میں نمایاں منفرد اور ممتاز ہیں۔

مسلم صاحب کی اب تک کل تیں کے قریب کتب شائع ہو چکی ہیں اور سوائے اک آدھ کے باقی تمام اردو زبان میں ہیں۔اس لئے ان کا زیادہ تر کلام اردو کے حوالے سے ہی معروف ہے۔لیکن اس کے باوجود پنجابی میں ان کی ایک ہی کتاب ''واگاں میں وَل موڑ'' نے ادبی حلقوں میں ایسے جھنڈے گاڑے کہ آج کی پنجابی شاعری میں دیکھتے ہی دیکھتے ان کا نام شہرت اور مقبولیت کے بام عروج پر جا پہنچا۔اور وہ صف اول کے شعرا میں شمار ہونے لگے یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے پنجابی کے نصاب میں شامل ہوگئی۔

اس کتاب نے اپنے انوکھے موضوع اور خوبصورت انداز بیان کے سبب ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔اور متعدد نقادان فن نے اسے زبردست انداز میں سراہا ہے۔اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کسی نے اس کتاب کی شاعری کو مقصدی اور افادی کہا تو کسی نے صوفیانہ اور

عارفانہ۔کوئی مسلم صاحب کی فکر کا موازنہ اقبال کی فکر سے کرتا ہے تو کوئی اس عہد ساز شاعر کو آج کا خواجہ فرید کہتے ہوئے ان کی شاعری کو ایک ادبی شاہکار کا درجہ دیتا ہے۔کسی کو یہ کلاسیک کے اونچے مرتبے پر فائز نظر آتی ہے تو کسی نے اسے جدید پنجابی شاعری میں ایک خاص مقام کا حامل قرار دیا ہے۔بات کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ مسلم صاحب کی پنجابی شاعری اپنے فکر وفن کے سبب ایک خاص حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے۔

کتاب ''واگاں میں ول موڑ'' کے پانچ حصے ہیں۔ازل تا ابد' رب سائیں' طیبہ داماہی' کافیاں اور کچ دے سفے''

''ازل تا ابد''ایک طویل نظم ہے جو کتاب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اس میں حمد باری تعالیٰ' پس منظر' پہلا منظر' دوسرا منظر' دعا بحضور باری تعالیٰ' نعت بحضور سرور کائنات' سلام بحضور خاتم النبین اور فریاد بحضور رحمت العالمین شامل ہیں۔

یہ طویل نظم 76 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی بحر سلطان العافین حضرت سلطان باہو کے معروف ابیات کی مترنم بحر ہے۔اس کی نغمگی کی اصل روح ''ہو'' کی وہ تان ہے جو اس کی ردیف ہے یہ ردیف استعمال کر کے جہاں مسلم صاحب نے بے مثال غنائیت کو اپنایا وہاں سلطان باہو کی شاعرانہ عظمت کا عملی اعتراف بھی کیا ہے۔نظم چار چار مصرعوں کے بندوں کی شکل میں یعنی مربع ہیئت میں ہے جو جدید پنجابی ادب میں ایک نیا تجربہ ہے۔یہ نظم اپنے موضوع اور انداز بیان کے باعث ایک نرالی تحریر ہے اور جہاں یہ مرکزی نظم ساری کتاب پر چھائی ہوئی ہے وہاں پنجابی ادب میں بھی ایک شاہکار تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔قرآن کریم کی مقدس آیات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی بے مثل صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اس بحر بیکراں کی غواصی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بند دیکھئے۔

ست سمندر دی رشنائی ساریاں رکھاں قلماں ہو
سب مک جاون لکھ نہ سکن رب سچے دیاں حمداں ہو

وا تا ڈاہڈا بے پروا تے اچرج اوہدیاں صفتاں ہو
دل دا دھیرج اکھ دی جوت تے سوچاں وچ چراغاں ہو

پس منظر کے عنوان سے انہوں نے کائنات کی تخلیق سے پہلے کا حال بیان کیا ہے پھر کائنات کی تخلیق کا خیال کائنات کا وجود میں آنا انسان کی تخلیق اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا بیان ہے۔یہ وہ نظارہ ہے جو آج تک کسی نے دیکھا نہیں۔بلکہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ حقیقت ہے کہ ازل اور ابد وقت کے دو کنارے ہیں جن کے آگے پیچھے ایک گہری دھند ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو اس کا مکمل علم نہیں۔لیکن مسلم صاحب نے اپنے رب کی بخشی ہوئی بصیرت کی روشنی میں اس منظر کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔پھر پہلے اور دوسرے منظر کے بعد دعا ہے اور آخر نعت رسول مقبولؐ ہے نمونے کے طور پر ان کا صرف ایک بند پیش ہے۔

نام محمدؐ جے اک واری میرے لب تے لہکے ہو
ہر ساہ میرا وانگ گلاباں ساری عمریں مہکے ہو
نور دے تڑکے دل دی نگری چڑیاں وانگوں چہکے ہو
سورج نکلے ہجر دا بھانبڑ سینے اندر دہکے ہو

اس طویل نظم کے علاوہ انہوں نے رب سائیں کے تحت چند حمدیں اور طیبہ داماہی کے تحت کچھ نعتیں تحریر کی ہیں اسی طرح چند کافیاں اور کچ دے نغمے کے تحت متفرق نظمیں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

پنجابی شاعری کی کلاسیکی روایت زیادہ تر تصوف اور معرفت کی روایت ہے اور اس روایت کا ایک بڑا حصہ کافی ہے۔مسلم صاحب نے بھی اس روایت کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ اسے نئے سرے سے زندہ کر دیا ہے۔ان کی نعت گوئی پرانی نعتیہ روایت سے کچھ الگ ہے کیونکہ اس میں جہاں تصوف اور معرفت کا رنگ ہے وہاں سیرت رسول کی خوبصورت عکاسی بھی ملتی ہے۔ان کی حمدیں ہوں کہ نعتیں کافیاں ہوں کہ نظمیں ہر جگہ ایک مقصدیت اور افادیت نظر آتی ہے۔جو ایسی شاعری کو زندہ اور آفاقی شاعری کا درجہ دیتی ہے۔

ہمارے کلاسیکی صوفی شاعروں کی طرح ان کا ایک ہی پیغام ہے امن اور محبت کا پیغام جس کو انہوں نے من موہنے ڈھنگ اور پر اثر لفظوں میں بیان کیا ہے۔انہوں نے عشق کے چراغ کی لو کو عام کرنے کے لئے اپنے جگر کے لہو کو فکر وفن کی آگ میں جلایا ہے تب جا کر یہ کندن حاصل ہوا ہے۔مسلم صاحب کا شعری سفر کم وبیش نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے اور یہ کتاب ان کے سارے سفر کا نچوڑ نظر آتی ہے۔انہوں نے اگرچہ اردو میں بڑا کام کیا ہے جو علمی وادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا ہے مگر پنجابی میں ان کا یہ ایک ہی کام سب پر بھاری ہے۔

مثمنِ مسلم "کاروان حرم" کا انگریزی روپ Road to Haram ہے۔اور یہ مسلم صاحب ہی کی کاوش ہے یہ طویل نظم بنیادی طور پر نبی آخرالزماں کا قصیدہ ہے اس کے اسلوب میں علم و فضل بھی ہے اور ایمان وعرفان بھی۔شاعر نے نہایت دلکش انداز میں تاریخ حقائق اور عشق رسول کو یکجا کر دیا ہے۔جس شے پر ہماری توجہ سب سے زیادہ مرکوز ہوتی ہے وہ اس کا شعری بہاؤ ہے جو شہد کے تازہ چشمے کی طرح ساری کتاب میں جاری ہے کتاب کی کئی حیثیتیں ہیں یہ سفرنامہ حج بھی ہے اور ایک روحانی سفر بھی اس میں مناسک حج کا تذکرہ بھی ہے اور پیغمبر اکرم کی سیرت اقدس کا پر اثر بیان بھی۔

اسے پڑھتے ہوئے بار بار شہرہ آفاق انگریزی شاعر ملٹن کا اسلوب یاد آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے نہایت کامیابی سے اپنی قلبی واردات کو موزوں الفاظ کا پیکر عطا کیا ہے۔نمونے کے طور پر ہم اس کا صرف ایک بند پیش کرتے ہیں جس میں شاعر نے فلسفہ سفر کو خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔کاروان حرم میں مسلم صاحب کا ایک بند ہے۔

محمد کا اپنے وطن سے سفر
ہوا شمع کا انجمن سے سفر
کہ خوشبو کا ٹھہرا چمن سے سفر
سخن کا حریم دہن سے سفر
نفس کا ہے حبسِ بدن سے سفر
کہ دھڑکن کا قلب زمن سے سفر

جو مکہ تھا دنیا میں سب سے عزیز
محمدؐ کی کھوئی ہے اس نے تمیز

اب اس کا انگریزی روپ دیکھئے۔

38. Muhammad's* Departure from homeland, 597
As the light exits from darkness; 458
Or fragrance dissipates from rose;598
Or escape of word from the sanctuary of lips;
Or of breath from life's clime;599
And of throbbing from pulse of time.228
Makkah that was dearer than all on earth's face;600
Had lost cognition of Muhammad's* grace.601

بچوں کیلئے مسلم صاحب نے امتیازی سلسلے کے تحت 9 منظوم کتابیں لکھی ہیں جو ہمارا دین ہماری تعلیم ہماری ملت ہمارا پاکستان ہم پاکستانی بچے ہماری سائنس، ہماری لوریاں، ہمارے گیت اور ہم پھول اس آنگن کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔یہ ننھی منی کتابیں رنگین اور با تصویر ہیں ان میں بچوں کی نفسیات کے عین مطابق نہایت آسان زبان میں نظمیں ہیں یہ شاعری ہمارے بچوں کے ادب میں ایک خوبصورت اور دلکش گلدستے کی طرح مہک رہی ہے۔جس کی افادیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

الغرض مسلم صاحب ایک ایسے ہمہ جہت شاعر ہیں جنہیں عہد حاضر میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ان کے فکر وفن کو جھاڑکھنڈ (جنوبی ہندوستان) سے لے کر کراچی تک اور دبئی سے قاہرہ تک جو پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ انہیں ایک عہد آفریں شاعر منوانے کیلئے کافی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

* Peace be upon him

محمود عالم کی افسانہ نگاری

ایک خوش فکر ادیب، سلیم الطبع صحافی اور باذوق کتاب دار (لائبریرین) کی حیثیت سے محمود عالم کی شخصیت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں، کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں اور علم وادب ان کی زندگی، برصغیر کے علمی اور فکری حلقوں میں وہ اسلامی ادبی تحریک سے وابستہ ایک تعمیر پسند نقاد کے طور پر اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔متعدد علمی وادبی کتابوں کے مصنف ومؤلف ہیں۔جن میں خالص ادبی موضوعات نمایاں ہیں۔تنقید وتبصرہ کے علاوہ تخلیقی ادب ان کا خاص میدان ہے۔اس سلسلے میں ان کی مطبوعات میں ایک ناولٹ ''عرب کا مجاہد'' افسانوی تصنیف '' لمحے بھر کا ہم سفر'' اور خاکوں کا مجموعہ ''زمانہ اس کو بھلا نہ دے'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''دل ناصبور'' ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔جس میں سولہ کے قریب افسانے شامل ہیں۔ترتیب کے اعتبار سے ان کہانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔''غم دوراں'' اور سرِ دلبراں'' ''غم دوراں'' کے تحت ایسے افسانے ہیں جن کا موضوع قومی اور بین الاقوامی سیاسی حالات ومسائل ہیں اور ''سرِ دلبراں'' کے زیرعنوان گوشے میں ایسی کہانیاں شریک ہیں جن میں محبت کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ان کے افسانے جنہیں عام طور پر کہانی کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان میں افسانویت سے کہیں زیادہ کہانی پن ہے، بیانیہ انداز کے حامل ہیں۔بیانیہ اسلوب یا ماجرا نگاری افسانے کا سب سے مقبول پیرایہ ہے۔اس طرز اظہار میں جہاں ترسیل وابلاغ میں آسانی رہتی ہے وہاں قاری پر اس کا براہ راست اثر بھی مسلم ہے۔محمود عالم چونکہ واضح طور پر ایک مقصدیت پسند ادیب ہیں۔اس لئے انہوں نے کہانی کا یہ معروف اور مقبول انداز اپنانے کی کوشش کی ہے۔یہاں تک کہ جہاں کہیں انہیں تمثیلی یا علامتی اسلوب برتنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔وہاں بھی ان کی علامات

ڈھکی چھپی اور پیچیدہ نہیں بلکہ اپنی نگارشات میں جگہ جگہ وہ ایسے واضح اشارے دے جاتے ہیں کہ علامت یا تمثیل کھل کر سامنے آجاتی ہے اور پڑھنے والے کو تفہیم میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اپنی ہر تحریر میں وہ ایک خاص مقصد اور پیغام کو سامنے رکھتے ہیں۔جسے قاری تک پہنچانا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔اور اس میں بلاشبہ وہ کامیاب بھی ہیں۔

آیئے اس مجموعے کی کہانیوں کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔''غم دوراں'' کی کہانیوں میں ''اوگھڑ'' ان کا ایک خاص افسانہ ہے جو موجودہ افغانستان کے سیاسی پس منظر میں اپنوں کی بے وفائی اور غداری کی نہایت موثر انداز میں ترجمانی کرتا ہے۔''اوگھڑ'' دراصل گنگا ندی کے کنارے بہار کے دارالحکومت پٹنہ کے قریب آباد ایک آدم خور ہندو فرقے کا نام ہے۔

''یہ لوگ گنگا کے کنارے جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔جب لوگ مردہ ارتھی کو چتا میں جلا کر گنگا میں بہاتے ہیں تو یہ لوگ اسے کسی طرح نکال لاتے ہیں۔پھر مردہ انسان کی کھوپڑی کو توڑ کر اس کا مغز کھاتے ہیں''۔

اسلام کے نزدیک غیبت گوئی چونکہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کے خیال میں اپنے بھائیوں کی غیبت اور مخبری کرنے والے بھی اوگھڑ ہی ہیں۔ جو اپنے ہم وطنوں سے بے وفائی اور غداری کرتے ہوئے ایک طرح سے اس گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔آخر میں افسانہ نگار ایک سوال اٹھاتا ہے۔

''کیا ہم سب اوگھڑ ہیں؟ شاید ہمارا مذہب بھی وہی ہے جو ان مردار خوروں کا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں ابھی تھوڑی سی ابکائی آجاتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ مرض بھی ختم ہوجائے گا۔تب ہم ''مہذب'' عالمی برداری میں شامل ہونے کے لائق ہوجائیں گے''۔

''خواجہ سرا ڈائسٹی'' ایک علامتی کہانی ہے جو عہد حاضر کی تحریک عالمگیریت پر ایک گہرا طنز ہے۔اس کہانی کی علامت خود بخود اپنا مفہوم واضح کرتی چلی جاتی ہے اور کہیں ترسیل کا کوئی مسئلہ

پیدا نہیں ہوتا ۔تاریخ کے پروفیسر اپنے لیکچر کے آغاز میں اس ڈائنسٹی کا تعارف یوں کراتے ہیں ۔

''یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ خواجہ سرا ڈائنسٹی کب شروع ہوئی ؟ لیکن اتنا ضرور ہے کہ برٹش ایمپائر کے بعد یہ سب سے بڑی حکومت تھی ۔جب برٹش ایمپائر کا زیر حکومت ممالک میں اچانک سورج غروب ہونے لگا تو انہوں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ غلامی کی زنجیروں کا رنگ بدل دیا جائے ۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس کر کے ان تمام علاقوں کو اپنی براہ راست حکومت سے آزاد کر دیا ۔اور ہر جگہ بالواسطہ حکومت کی بنیاد ڈالی ۔اور ہر جگہ اپنے وفاداروں کو اقتدار کی کرسی مہیا کر دی''۔

ایک طالبہ مس شبانہ کے سوال کے جواب میں پروفیسر کہتے ہیں ۔

''میڈیا پر پورا کنٹرول خواجہ سرا حکومت کا تھا ۔بس وہی خبریں نشر ہوتی تھیں جن کی وہ اجازت دیتے تھے ۔پوری دنیا کی نیوز ایجنسیاں ان کی غلام تھیں ۔معلومات پر ایسی اجارہ داری تاریخ کے کسی دور میں دیکھنے کو نہیں ملی ۔معلومات ہی کیا معاش اور علم دونوں کے تمام سوتوں پر خواجہ سراؤں کا قبضہ تھا''۔

ایک اور طالبہ کے سوال پر پروفیسر پر گہری سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں ۔

''آہ اس عہد میں سب سے بڑی مصیبت عوتوں ہی پر آئی ۔شروع شروع میں وہ بہت خوش ہوئیں کہ چلو مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزادی ملی ۔لیکن جلد ہی اس آزادی سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا ۔ان کے چاروں طرف خواجہ سرا ہی خواجہ سرا تھے ۔اور جو بظاہر مرد تھے ۔وہ بھی اصلیت کے اعتبار سے وہی تھے''۔

''تماشا مرے آگے''۔ایک بہروپئے کی کہانی ہے ۔جو عراق کی حالیہ جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے ۔اس کی تمثیل بھی واضح ہے ۔بہروپیا ہر روز ایک عالمی سیاستدان کا سوانگ بھرتا ہے ۔

''اگلے دن اس نے ایک مخصوص قسم کا کوٹ اور پینٹ پہن رکھا تھا ۔سر پر ایک ہیٹ تھا جس

پر ستاروں کے نشان بنے تھے ۔وہ ہر دکان کے پاس جاتا اور ہیٹ اتار کر سر کو ذرا خم کر کے مخصوص لہجے میں لوگوں کو مخاطب کرتا ۔خطرناک ہتھیار نہیں ملے ۔آئی ایم سوری ۔جب وہ بوڑھے خوانچے والے کے پاس پہنچا تو اس نے اسے بڑی موٹی سی گالی دی ۔سالا بہروپیا ۔ہتھیار ملا نہیں ملا ۔صرف شبہ میں ہزاروں انسانوں کو مار ڈالا ۔اب آئی ایم سوری بولتا ہے''۔

''اب کوئی گلشن نہ اجڑے''۔بھارت کے شہر احمد آباد (گجرات) کے مسلم کش فسادات کے موضوع پر ایک نہایت پر اثر افسانہ ہے ۔افسانہ نگار اپنے کرداروں کے ذریعے حالات کا بے لاگ اور بے لوث جائزہ لیتا ہے ۔

''فسادیوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔وہ نہ ہندو ہوتے ہیں اور نہ مسلمان بلکہ وہ مذہب کے نام پر کلنک ہوتے ہیں ۔آج جو لوگ شیطانیت کا ننگا ناچ ناچ رہے ہیں' نہ تو رحمٰن کے بندے ہیں اور نہ رام کے بھگت ۔یہ سب شیطان کے بندے ہیں ۔''

افسانے کا ہیرو ارشد اپنے بڑے بھائی کو جب ایک زہریلا محلول دکھاتے ہوئے کہتا ہے ۔''یہ محلول ہزار آدمیوں کی موت کا باعث بن سکتا ہے ۔''تو بڑے بھائی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے ۔

''ارشد! تو یہودی کب سے ہو گیا ؟ یہ باتیں جو تو کر رہا ہے ۔یہ تو صرف ایک یہودی ہی سوچ سکتا ہے ۔مسلمانوں نے اپنے عروج کے عہد میں بے شمار چیزیں ایجاد کیں ۔لیکن کبھی ایسی چیز ایجاد نہیں کی ۔جو انسانیت کے لئے مہلک ہو ۔کیا تو نے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھا ؟ ۔جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمیں میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا ۔اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا ۔اور جس نے کسی انسان کو زندگی بخشی ۔اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشی ۔''

اس طرح کہانی کار اسلام کے پیغام صلح و سلامتی کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے ۔

''صاحب کا کتا'' عالمی تناظر میں ایک ایسی تمثیلی کہانی ہے جس کی علامتوں میں کوئی پیچیدگی

نہیں ۔قاری ان تک آسانی پہنچ سکتا ہے ۔

"بُزِ مردار" میں براعظم امریکہ کی مادی اور سائنسی ترقی کا خوفناک انجام مستقبل بین نگاہوں سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔کہانی کے آخر میں اسے ہمیشہ کے لئے زندہ رہنے کے عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے ۔فرشتے بوڑھے پادری سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔

"ہاں ہاں خداوند خدا کا یہی فیصلہ ہے کہ اس بزِ مردار پر کوئی عذاب نہیں لایا جائے ۔

تمہارے لئے زندہ رہنے کا عذاب ہی کافی ہے ۔"

یہ سن کر بوڑھا چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا ۔

"ایک دوست کا مرثیہ" دراصل ایک ادیب کے ضمیر کی موت کا مرثیہ ہے اور پڑھنے والوں کو ایک لمحۂ فکریہ دے جاتا ہے ۔

"واعظ' خطیب' محتسب اور فقیہ بک جائیں ۔یہ ممکن ہے ۔لیکن ایک قلندر کیسے بک سکتا ہے؟ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں اس طرح کا کوئی واقعہ مذکور نہیں ہے ۔کیا ہم تاریخ کے خاتمے پر پہنچ چکے ہیں؟

"صیل مرغ" ایک ایسی کہانی ہے ۔جو نسلی تفاخر کے احساس میں ڈوبے ہوئے مسلمانانِ عالم کی باہمی آویزش پر ایک بھرپور طنز ہے ۔اسی طرح "سونامی" حالیہ سمندری تموج کے موضوع پر ایک خیال انگیز تحریر ہے ۔کہانی کا ایک اہم کردار مختلف نوجوانوں کے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہوئے ان کی ذہنی الجھن دور کر دیتا ہے ۔

"بھلائی کا آدیش دینا اور برائی سے روکنا مسلمانوں کی مذہبی ذمہ داری ہے ۔لیکن آج مسلمان اس فرض کو ادا کرنے کی بجائے خود ہی برائی میں مبتلا ہیں تو کیا ایشور ان سے ناراض نہیں ہوگا؟"

"سِرِ دلبراں" کے تحت "خوشبو" ۔"طائرانِ حرم" اور "دیدۂ تر" محبت کے لطیف جذبے کی ایسی خوبصورت کہانیاں ہیں جو پڑھنے والے پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں ۔"انوکھا تجربہ" حرم مکی کی پرنور فضا میں ایک معجزاتی واقعے کا بیانیہ ہے ۔جس کا اپنا تاثر ہے ۔

"سفید جھوٹ" دروغ مصلحت آمیز بازراستی فتنہ انگیز کی فنکارانہ توضیح وتشریح ہے ۔

"ایک دل ناصبور" مسلسل بے توجہی اور بے رخی کے رد عمل کے طور پر نفرت کی نشاندہی کرتی ہے ۔تو بغیر عنوان کے کہانی پشیمانی کے احساس کی ترجمان ہے ۔یہ دونوں کہانیاں نفسیاتی موضوع پر ہیں اور ان میں انسانی نفسیات کی دل نشیں عکاسی کی گئی ہے ۔

ان تمام کہانیوں میں "سرِ دلبراں" کی کہانیاں زیادہ تر روایتی موضوعات پر روایتی انداز کی کہانیاں ہیں ۔جن میں قارئین کے لئے دلچسپی اور دل پذیری کا وافر سامان ہے ۔لیکن اس مجموعے میں محمود عالم کا اصل فن غمِ دوراں کے تحت لکھی گئی لمحۂ موجود کے عالمی سیاسی اور سماجی مسائل پر مبنی کہانیاں ہیں ۔جن کے موضوعات میں بھی تنوع ہے اور اسلوب میں بھی ایک نیا پن ہے ۔اس سے پیشتر حالاتِ حاضرہ پر اس انداز سے کم ہی طبع آزمائی کی گئی ہے ۔

ان کہانیوں میں مقصدیت صاف جھلکتی ہے ۔محمود عالم جہاں آج کی عالمی سیاست کا گہرا شعور وادراک رکھتے ہیں ۔وہاں انسانیت کے درد سے معمور ایک حساس دل کے بھی حامل ہیں ۔وہ ایک تعمیر پسند ادیب ہیں اور انسان دوستی ان کی رگ رگ میں موجزن ہے ۔یہی وجہ ہے کہ عصری آگہی اور عصری حسیت ان کے طرز نگارش کا طرۂ امتیاز ہے ۔انہوں نے ہمارے عہد کی سنگین صداقتوں اور بے رحم حقیقتوں کی ترجمانی اس دلکش اور پراثر اسلوب میں کی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں یہ تو ہمارے ہی دل کی بات کہی گئی ہے ۔

ان کا ایک مقصد تو آج کی نئی نسل کو ان مسائل ومباحث سے روشناس کرانا ہے جو آئندہ عالم انسانیت کے لئے شدید خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں ۔دوسرے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کر کے اسلام کے حقیقی پیغام امن و آشتی کو عام کرنا ہے ۔یہ دونوں مقاصد بہت اعلیٰ اور نیک ہیں ۔اور خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے افسانے اور کہانی کے پیرائے میں نہایت موثر' معیاری اور دلچسپ تخلیقات کے ذریعے ان مقاصد جلیلہ کو قارئین تک پہنچانے کی سعئ بلیغ کی ہے ۔امید ہے یہ کہانیاں ہمارے افسانوی ادب کے ذخیرے میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوں گی ۔

محبت کے رچاؤ میں ڈوبی ہوئی آواز

خلاق ازل نے تصویر کائنات میں حسن ومحبت کا رنگ بھرنے کے لئے عورت کو تخلیق کیا۔ زندگی کے سفر میں مرد کی یہ ساتھی قدم قدم پر اس کے لئے وجہ سکون وراحت اور اس کے دکھ درد کا درماں رہی ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن آدم کی راہوں کو پھولوں سے معطر رکھنے کے لئے خود بنت حوا مصائب کے کانٹوں سے لہولہان ہوئی ہے۔اور یہیں وہ ایثار اور قربانی کا پیکر بن کر معصومیت اور عظمت کی بلندیوں پر فائز ہوتی ہے۔عورت کے اس مقام کو کئی بار گرانے کی بھی کوشش کی گئی۔لیکن ہر بار عورت امتحان وفا میں سرخرو رہی ہے۔انسانی زندگی میں عورت کے مختلف روپ ہیں۔ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ۔اور اپنے ہر روپ میں وہ حسن ادا کی امین ہے۔اس نے ہر روپ میں انسانیت کا مان رکھا ہے اور محبت اور خلوص کا انمول خزانہ بے انداز لٹایا ہے۔اور اس کی یہ بے مثال عطا مرد کی استقامت اور حوصلے کا باعث بنی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے۔ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔یہ عورت زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی ہے۔لیکن فنونِ لطیفہ خاص طور پر اس صنفِ لطیف کے زیر اثر رہے ہیں۔اور شاعری کا مرکز ومحور تو ہے ہی عورت کا حسن اور اس کی محبت۔دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت قدرت کا ایک خوبصورت شعر ہے۔جس طرح شعر خود شاعر نہیں ہوسکتا۔اس طرح کہا جاتا ہے کہ عورت شعر کا موضوع تو ہوسکتی ہے خود شاعر نہیں ہوسکتی۔لیکن ادب عالم شاہد ہے کہ اس کلیئے میں ایک استثناء بھی ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں عورتوں نے شاعری کی ہے۔خود اردو زبان میں ایک سے بڑھ کر ایک شاعرہ گزری ہے۔جس نے اپنے آپ کو اپنے فن کے زور سے منوایا ہے۔

مسرت جبیں زیبا بھی اس قبیلے کی ایک فرد ہیں۔

وہ ایک عرصے سے وطن عزیز سے دور دیارِ غیر میں اردو شعر وادب کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے ان سے تعارف ہوا۔وہ اپنے بھائی اور ہمارے دوست رائے آصف علی سے ملنے ملتان آئی ہوئی تھیں۔وہیں معلوم ہوا کہ وہ کویت میں ہمارے محترم حامد کرتارپوری کی منہ بولی بیٹی بھی ہیں۔انہی دنوں غالباً ان کے پہلے مجموعہ کلام کی تعارفی تقریب بھی

تھی۔جس نے شائع ہوتے ہی ارباب ادب کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔

ان کی اب تک چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔"رخ زیبا" "پہلا آنسو موسم کا" "چاہتیں بے اصول ہوتی ہیں" اور "چلے بھی آؤ بہار رت ہے"۔

"رخ زیبا" میں جمال دوست کی زیبائی کا ترنم بھی ہے اور یاد ماضی کی صدائے بازگشت بھی۔ان کا لہجہ بڑا مدھم اور کومل ہے۔

چند شعر دیکھئے۔

پڑا جو وقت تو سب نے بدل لیا لہجہ
وگرنہ ہم سے رہیں آشنائیاں کیا کیا

بس اتنا سوچ کے خود کو سنبھال لیتے ہیں
جہاں میں ہم سے بھی بڑھ کر ستم رسیدہ ہیں

وہ تو اک ٹوٹتا ستارہ تھا
جس کو ہم روشنی سمجھ بیٹھے

اور

ہو چکا ہے خون دل کتنا' یہ اندازہ کریں
آؤ بیٹھو بھولے بسرے پھر سے غم تازہ کریں

غموں کی یہ تازگی ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "پہلا آنسو موسم کا" پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ہجر و فراق کی جلتی بجھتی رم جھم اور محبت کی دھیمی دھیمی پھوار اس مجموعے کے ایک ایک شعر سے پھوٹی پڑتی ہے۔

یہ شعر دیکھئے۔

مجھ سے آنسو مانگ کے رکھا سارے جہاں پر برسی ہے
میں نے ہاتھ پہ رکھ کر دیکھا پہلا آنسو موسم کا

موسموں کی سازشیں ہوتی رہیں
دل ہی دل میں بارشیں ہوتی رہیں

یاد آ گیا بچھڑنا تمہارا ستم ہوا
کانٹا سا دل میں چبھ کے سرِ شام رہ گیا

یادکی یہ خلش ان کے تیسرے مجموعۂ کلام ''چاہتیں بے اصول ہوتی ہیں'' کے ورق ورق میں پنہاں ہے۔چاہتوں کا ہلکا ہلکا درد اور غموں کو چبھتی ہوئی ٹھیس ان کے حرف حرف کی زینت ہے۔آیئے دیکھئے۔

غم کا زیور درد کے شوکیس میں اچھا لگا
دل کو جو اچھا لگا ہر بھیس میں اچھا لگا

پھول چنتے چنتے میری روح زخمی ہو گئی
اور میرے جسم میں آئی نہیں کوئی خراش

میری نس نس میں اک کرن لپٹی
جب چڑھا ایک رات پیار کا چاند

نظر چرا کے گزرتی ہوں جس سے میں اکثر
کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آشنا کی طرح

میں اب تک مشورے ہی کر رہی ہوں
مگر وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے

یہ کیفیت واردات ومعاملات دل کو روشن کرتی ہوئی انتظار کی خوشبو کی نشاندہی کرتی ہے جو ان کے چوتھے مجموعہ کلام ''چلے بھی آؤ گلاب رت ہے'' کی سطر سطر میں مہک رہی ہے۔شاعرہ نے اپنے تجربات،مشاہدات اور محسوسات کو خون جگر کی روشنی سے چمکا دیا ہے۔ذرا یہ چمک دیکھئے۔

سونا چمک اٹھا تھا ذرا دیر یاد کا
پلکوں پہ کتنے سرخ نگینوں کا بوجھ ہے

تمہارا نام مٹاتی رہی میں لکھ لکھ کر
تمام رات مری انگلیوں میں درد رہا

گر اہل ظرف ہو تو بتاؤ قد آورو!
کتنی بلندیاں ہیں جو پستی پہ بوجھ ہیں

کسی بھی سانچے میں وہ ڈھل سکا نہ، پتھر تھا
ہمارے کام نہ آئی ہماری شیشہ گری

آ کے دیکھو تو چند تنکے ہیں
دور سے ہے جو آشیاں جیسا

اب آئینہ کہاں ہے کانچ ہے بس
میں چہرہ دیکھنے سے ڈر رہی ہوں

کیا ضرورت ہے اب چراغاں کی
آنسوؤں کی برات اپنی ہے

میں جہاں بھی ہوں اپنی فکر میں ہوں
جانے کس رنگ میں وہ رہتا ہے

آواز کی یہ سادگی اور لہجے کی یہ معصومیت،مسرت جبیں زیبا کے دل دردمند کی دین ہے۔ پردیس نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا اور دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں نے اس حساس اور پرخلوص شاعرہ کے اسلوب میں بصیرت وبصارت کا خوبصورت امتزاج پیدا کر دیا۔ان کی شاعری ایک مکمل عورت کی ترنم ریز آواز ہے،جو محبت کے رچاؤ میں پوری طرح ڈوبی ہوئی ہے۔اور جس کا اثر مسلّم ہے۔ان کا فن مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔جو خوب سے خوب تر کی طرف رواں ہے۔

جاگتے خوابوں کا شاعر نسیم سحر

نسیم سحر میرے نصف ہم نام اور ہم تخلص ہیں۔ان سے میرے تعارف کا عرصہ کوئی تیس پینتیس سال پر محیط ہے۔لیکن ہماری با قاعدہ دوستی کا آغاز ۱۹۸۸ء سے ہوا۔جب میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب آیا۔میرا قیام اپنے عزیزوں کے ساتھ جدے میں تھا' یہیں نسیم صاحب سے پہلی با لمشافہ ملاقات ہوئی' وہ جس وارفتگی اور اپنائیت سے ملے' آج تک اس کی مہک تازہ ہے۔پھر یوں ہوا کہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنے بیٹوں کے پاس سعودی عرب چلا آیا۔چنانچہ اب جدہ بھی میرا آنا جانا رہتا ہے۔میں جدہ جاؤں اور نسیم سحر سے نہ ملوں' یہ ممکن ہی نہیں۔کیونکہ میں جدہ اور نسیم سحر کو لازم وملزوم سمجھتا ہوں۔یوں تو ریاض' دمام اور جدہ کے تمام ادبی دوستوں نے میری بے حد پذیرائی اور عزت افزائی کی ہے۔لیکن نسیم ان میں سب سے پیش پیش ہیں۔وہ ایک مخلص' پر تپاک اور وضعدار انسان ہیں۔مہمان نوازی اور دوست داری ان کے خون میں شامل ہے' کہ وہ خود پوٹھوہار کے ایک نہایت وضعدار علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔جس کے سربراہ عبدالعزیز فطرت مرحوم تھے۔ایوب محسن کے علاوہ اپنے خانوادے میں نسیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنے خاندان کی ادبی روایات کے امین ہیں۔

وہ ایک انتھک اور فعال قلمکار ہیں جس تواتر اور تسلسل کے ساتھ وہ نظم ونثر میں لکھتے ہیں۔اسی تواتر اور تسلسل سے دنیا بھر کے ادبی جرائد میں چھپتے بھی ہیں۔اس لئے ان کا نام اردو دان قارئین کے لئے پوری طرح جانا پہچانا ہے۔سعودی عرب اور خاص طور پر جدہ کی کوئی ادبی سرگرمی ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔گزشتہ تقریباً ربع صدی سے وہ جدہ میں مقیم ہیں۔اور صرف جدہ ہی نہیں پورے سعودی عرب کی علمی' ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں وہ رات دن فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔آج عرب کے صحرائے ادب میں جگہ جگہ شعر وسخن کے جو تازہ گلاب بہار دکھا رہے ہیں ان کی باغبانی میں سب سے زیادہ نسیم سحر کا خون جگر شامل ہے۔انہی گراں قدر خدمات کے لحاظ

سے ہم انہیں پورے سعودی عرب کی نمائندہ ادبی شخصیت کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

کسی سچے فنکار کا فن اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے اور نسیم کا فن بھی ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا پوری طرح ترجمان ہے۔ان کی شخصیت بنیادی طور پر تین عناصر سے مرکب ہے' محبت' صداقت اور تحرک۔اور غور کیا جائے تو یہ محاسن ان کی نگارشات کے خصائص بھی ہیں۔وہ ایک پر گو شاعر ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف' شاعری میں حمد ونعت ہو یا ہائیکو اور نظم ہو یا غزل' ہر میدان ان کی جولان گاہ ہے۔لیکن شہسوار وہ غزل کے ہیں۔اردو کے معروف ومتاز نقاد ڈاکٹر انور سدید کے بقول "نسیم سحر نے جدید اردو غزل کو نئی کروٹ دی ہے"۔اور میرے خیال میں یہ ایک مختصر سا جملہ ہی ان کی شاعری کے لئے سب سے بڑا خراج تحسین ہے۔آیئے! ذرا اس اجمال کی تفصیل میں جائیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک جدید شاعر ہیں۔تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دور حاضر کے ان شاعروں میں شامل ہیں جن کا اسلوب فکری اور فنی لحاظ سے جدید ہے۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہماری شاعری کی قدیم یعنی کلاسیکی روایت سے لاتعلق ہیں۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی جدیدیت روایت سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ظاہر ہے کوئی عمارت بغیر بنیاد کے ہوا میں تو تعمیر نہیں ہو سکتی۔بنیاد جتنی گہری اور مضبوط ہوگی' عمارت اتنی ہی پختہ اور محکم ہوگی۔غزل یوں بھی ہماری قدیم شعری روایت کا ایک ایسا تسلسل ہے جو آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔وقت بدلا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضے بدلے' تو اس صنفِ سخن نے بھی ہر دور میں نئی ہواؤں اور نئی فضاؤں کا ساتھ دیا۔یہی وجہ ہے کہ اس میں کبھی کہنگی اور فرسودگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔اور یہ آج بھی ہماری شاعری کی سب سے زیادہ مقبول اور نمائندہ صنف کے طور پر زندہ ہے۔

نسیم سحر کے یہاں فکر وفن کی جدیدیت انہیں ایک قد آور اور توانا شاعر کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے۔ان کی شاعری میں فکری لحاظ سے جہاں نئی سیاسی اور سماجی صورتحال کا احساس اور اظہار موجود ہے وہاں فنی اعتبار سے جدید لسانی تشکیل کا عمل نئی لفظیات کی صورت میں ملتا ہے۔وہ متعدد اور متنوع بحروں پر مبنی نئی نئی زمینوں میں شعر کہتے ہیں' جو ان کی زبردست طباعی اور مشاقی کی دلیل ہے اس سلسلے میں ان کے بے ساختہ مطلعے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔جن میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ترنم اور نغمگی بھی رچی بسی ہے۔مثلاً

دیا تھا اس نے جو غم کا خزانہ ختم ہوتا ہے
سو یہ بھی زندہ رہنے کا بہانہ ختم ہوتا ہے

ہے شرطِ سفر یہ کہ ادھر بھی نہیں جانا
لیکن کہیں رستے میں ٹھہر بھی نہیں جانا

وجود اپنا مجھے بیکراں نظر آیا
جب ایک ذرے میں سارا جہاں نظر آیا

اسی طرح ان کے جسدِ شاعری میں ان کی مضمون آفرینی تازگی اور ندرت کی زندہ فضا میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

آج یوں دل میں اس کی یاد آئی
جیسے چلنے لگے قفس میں ہوا

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں ہے دھوپ کہیں بارشوں کا موسم ہے

گلاب لہجے میں کرتا ہوں بات میں جس سے
وہ بات بات پہ تلوار کھینچ لیتا ہے

اس سے پہلے اس کے تصور سے میں نے باتیں کی ہیں
چاند سے پہلے چاند کے ہالے کی تصویر بنائی ہے

نئی لفظیات کے ضمن میں ان کے صرف دو شعروں کی مثال پیش ہے۔

ہوش کھو بیٹھوں کاش اک دن میں
اور اسے دیکھ بھال میں دیکھوں

وہ جو ساحلوں کے حصار میں نہ سمٹ سکے
انہی پانیوں کے اچھال میں اسے ڈھونڈ

ان شعروں میں "دیکھ بھال" اور "اچھال" دو ایسے الفاظ ہیں جن کا نسیم نے غزل میں نیا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ایک شعری مجموعے کا انتساب بھی سب سے منفرد اور سب سے الگ ہے۔

اسی کے نام ہے یہ، جس کا نام لے نہ سکوں
مری کتاب کا ہے انتساب سب سے الگ

وہ وسیع مطالعے اور عمیق تجربے کے حامل ہیں۔ عہدِ موجود کی نئی سیاسی اور معاشی صورتحال کی طرف وہ اس انداز سے پر معنی اشارے کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کی ذات کا کرب اور آشوب آگے بڑھ کر پورے معاشرے کا کرب یعنی شہر آشوب بنتا صاف محسوس ہوتا ہے۔

شاہ کو اس کے وزیروں نے بتایا ہی نہیں
اس کے درباری وفادار کسی اور کے ہیں

دیکھ کر رنگ ڈھنگ دنیا کے
فاختہ ہو گئی عقاب مزاج

سمندر پار کرنے کے لئے بیتاب ہیں کتنے
سفینے بھی سبھی غرقاب رکھنا چاہتے ہیں ہم

خزاں ہی آئے اگر موسم بہار نہیں
رہے نہ شہر مگر درمیاں کے موسم میں

پھول ہی پیش کروں گا میں بہر حال انہیں
جانتے ہیں یہ مجھے زخم لگانے والے

نسیم کا انسانی نفسیات کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔غزل میں نفسیاتی مسائل وحقائق کا اظہار پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔لیکن اس اسلوب کو جس سلیقے سے نسیم نے اپنایا ہے وہ شاید بہت کم لوگوں کا حصہ ہے۔ترک وطن کا کرب، تبدیلی کی خواہش اور نئے حالات کا ادراک انہیں اظہار وبیاں کے نئے پر گداز پیرایوں کی طرف لے آتا ہے۔

تجھے ہم یاد کرنا چاہتے ہر گز نہیں لیکن
یہی اک کام اکثر بے ارادہ کرتے رہتے ہیں

اب کیا بتائیں کیسے ارادہ بدل گیا
گھر سے تو ہم چلے تھے ترے آستاں کی سمت

مرے سفر میں جواب تک شریک نہ ہو سکا
اسی شریک سفر کی کہانی ختم ہوئی

ضروری تو نہیں لوٹوں بھی میں گہرے سمندر سے
اتر کر اس کی تہہ میں بھی کنارا دیکھ سکتا ہوں

یہی اک تمنا ہے دل میں مکیں
کہ دیکھیں کبھی ہم بدن خواب کا

خواب کے بدن کا نظارہ کرنے کے تمنائی نسیم سحر زبردست حقیقت پسند بھی ہیں۔جدید حسیت کے ساتھ نئے سماجی اور سائنسی حقائق کا شعور وادراک انہیں اظہار وابلاغ کا وہ پیرایہ عطا کرتا ہے جو

پوری طرح روح عصر کے ہم آواز وہم آہنگ نظر آتا ہے۔اس تناظر میں یہ شعر دیکھئے۔

ماحول کے غبار نے چھینی چمک دمک
مٹی میں مل گیا تو گہر خاک ہو گیا

لرز رہا ہے قلم، انگلیاں لرزتی ہیں
بہت بڑی کوئی سچائی لکھنے والا ہوں

اخباروں میں اپنی مرضی کی خبریں کیا دیتے ہو؟
یہ تو دیکھو! شہر کی دیواروں پر کیا لکھا ہے؟

موت دکھلاتی ہے اک اور صداقت ہم کو
ہم سمجھتے تھے فقط زندگی سچ بولتی ہے

بوسیدگی اس شہر پہ یوں چھائی ہوئی ہے
جو چیز نئی بھی ہے، پرانی نظر آئے

نسیم کا ایک شعر ہے

میں تو صحرا کا مکیں ہوں مجھے معلوم نہیں
کیسا ہوتا ہے سمندر کے کنارے موسم؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر انہوں نے عرب کی مجموعی صحرائی فضا کو سامنے رکھ کر کہا ہوگا۔ورنہ سمندر کے کنارے رہنے والا شاعر اس کے موسم سے نا آشنا نہیں ہوسکتا۔اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک اور جگہ خود ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔وہ کہتے ہیں۔

دریا ہوں اور سمٹنے کی عادت نہیں مجھے
ساحل کے ساتھ میں نہیں ساحل ہے میرے ساتھ

یوں ان کی ذات اجتماع میں گم نہیں ہوتی
بلکہ وہ اجتماع کو ساتھ لئے محوِ سفر رہتی ہے

جغرافیائی ماحول کا اثر فطری طور پر فنکار کے فن پر کسی نہ کسی انداز سے ضرور پڑتا ہے۔نسیم چونکہ ساحلِ سمندر کے قریب رہتے ہیں اس لئے بظاہر تو ساحل کا سکون اور طمانیت ان کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔لیکن غور کریں تو ان کے بطون میں گہرے سمندر کا تموج اور تلاطم صاف دکھائی دیتا ہے۔جو ان کی ذات کو تخلیقی سطح پر ہر پل ہر آن تحرک اور سفر کے لئے بیتاب و بیقرار رکھتا ہے۔ اور میرا خیال ہے یہی ایک سچے صاحب فن کی پہچان ہے۔

نسیم سحر اپنی ریاضت فن کے مل بوتے پر اب اس مقام پر ہیں۔جہاں انہیں کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں'ان کا نام اور کام دنیائے ادب میں پوری طرح جانا پہچانا ہے۔وہ ایک مشاق اور پرگو شاعر ہیں۔

''چہرۂ خواب''ان کی دسویں شعری دستاویز ہے۔جس میں صرف ان کی غزلیں شامل ہیں۔ گویا ان کے شعری سفر میں یہ مجموعہ ان کی دسویں منزل ہے۔لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کا سفر شوق جاری ہے اور یوں ہر لحظہ نئے طور اور نئی برق تجلی کا انہیں سامنا ہے۔

اس مرتبہ اپنے شعری نوشتے کا نام انہوں نے اپنے اس شعر سے ماخوذ کیا ہے۔

اس کا لہجہ ہے کہ ہے لہجہ گل
اس کا چہرہ ہے کہ ہے چہرہ خواب

اور حقیقت یہ ہے کہ چہرۂ خواب کو بیان کرنے کے لئے لہجہ گل ہی شایان شان ہے۔اب آپ جانتے ہیں کہ نسیم سحر سے بڑھ کر لہجہ گل کس کا ہوسکتا ہے کہ خوشبو اس کا خاص پیرایۂ اظہار ہے۔

خواب عام طور پر انسان کی تشنۂ تکمیل آرزوؤں اور اس کی ادھوری خواہشوں کا آئینہ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ انہیں کھلی آنکھوں سے دیکھے یا بند آنکھوں سے ان کا نظارہ کرے۔وہ اپنی بیتاب تمناؤں کا عکس اسی ہزار پہلو آئینے میں دیکھتا ہے۔یہی اس کا مثالیہ ہے اور یہی اس کا آئیڈل جو وہ ہر رات دیکھتا ہے۔

دیکھتے رہتے ہیں ہر رات نسیم
عکس اس کا سرِ آئینۂ خواب

اور اگر سوئے اتفاق سے یہ آئینہ کسی سنگِ حقیقت سے شکستہ ہوجائے۔تو پھر آنکھ میں کوئی منظر روشن نہیں رہتا۔

پھر ہوتا نہیں آنکھ میں روشن کوئی منظر
ہو جائے اگر آئینۂ خواب شکستہ

شاعر کا خواب عموماً جاگتی آنکھوں کا خواب ہوتا ہے کہ وہ حقیقت ہی کا دوسرا پرتو ہے جسے وہ اپنی تخیئل کے عالم میں زیادہ خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔نسیم سحر کا خواب بھی جاگتی آنکھوں کا خواب ہے کہ اس کے چہرے کا افسانہ بیداری کی کیفیت میں لکھا گیا ہے۔

نسیم اس خواب چہرے کا فسانہ
بہت جاگے ہیں تب لکھا گیا ہے

یہی وجہ ہے کہ وہ جاگتے منظروں کے مقابلے میں خواب کی پرچھائیوں کا شیدا ہے۔

تمام جاگتے منظر ہیں ایک سمت نسیم
اور ایک خواب کی پرچھائیاں ہیں ایک طرف

اور پھر تمام عمر انہی پرچھائیوں کی جستجو میں وہ ہر دم رواں رہتا ہے۔

اسی کی اب بھی مجھے جستجو ہے جو اب تک
پرے ہے خواب سے اور ہے خیال سے باہر

اس خواب چہرے کی تصویر کشی میں شاعر مختلف نقوش ابھارتا چلا جاتا ہے۔

ارادہ یہ تھا کہ کاغذ پہ تو مصور ہو
ستارے' پھول' دیے' تتلیاں بنائے گئے

اور اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے اسے اپنے بدن کا تمام لہو بھی صرف کرنا پڑے تو وہ

گریز نہیں کرتا۔

لہو میرے بدن کا صرف اس میں ہو گیا تو کیا
تری تصویر میں یہ رنگ بھرنا بھی ضروری تھا

لیکن اسے جلد ہی اپنی نارسائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

آواز اس کی گونج رہی ہے چہار سو
میں ڈھونڈنے لگوں تو کہیں پر نظر نہ آئے

اور

تجسیم کر رہا ہوں تصور میں جس کی میں
شاید کبھی نسیم وہ پیکر نظر نہ آئے

اور اگر کہیں عالم خواب میں اس کا کوئی خاکہ نظر آئے۔تو پیکر محبوب کے رنگ ہی اسے نکھارتے ہیں۔

رنگ اس میں ترے پیکر نے بھرے
خواب میں دیکھا تھا جو خاکۂ خواب

شاعر کی نظر میں اس کا چہرۂ خواب تقدیس میں لپٹا ہوا ایک صحیفہ ہے۔جس کی تلاوت اس کے نزدیک ایک عبادت سے کم نہیں۔

کسی مصحف کی طرح اس کا رخ روشن ہے
کر رہا ہوں میں تصور میں تلاوت اس کی

اور

سامنے آتی ہے جب دھیان میں صورت اس کی
کرنے لگتی ہیں مری آنکھیں عبادت اس کی

ان جاگتے خوابوں کے عکس اکثر اسقدر دھندلے ہوتے ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل

ہو جاتا ہے۔تشکیک اور تجدید کی ایک چادر سی پوری فضا پر تنی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ایسے میں اس پیکر کے رنگ تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔کہ یہ ایک کہر آلود اور ابر آمیز پس منظر میں چھپے ہوتے ہیں۔اور یوں بعض اوقات حقیقت اور خواب میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔

جاگتی آنکھوں جو ہم دیکھتے ہیں
وہ بھی ہے اصل میں پیرایۂ خواب

نسیم سحر کی خواہش ہے کہ وہ دروازۂ خواب کو کھول کر اور پردۂ خواب کو الٹ کر حقیقت کے رنگوں کو نہ صرف دریافت کرے بلکہ اس خاکے میں اپنے خون جگر سے کچھ ایسے رنگ بھی بھرے۔جو اس چہرے کو اور زیادہ تابناک اور دلکش بنا دیں۔دوسرے لفظوں میں وہ خوابوں کے حوالے سے زندگی کے رنگا رنگ حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے۔

عمر بھر کیوں رہیں وابستۂ خواب
کھول کر دیکھ لیں دروازۂ خواب

اور

ہم بھی پالیں گے حقیقت آخر
ہم بھی الٹیں گے کبھی پردۂ خواب

آیئے اس کے ساتھ ہم بھی یہ پردہ الٹ کر چہرۂ خواب کے خدوخال دیکھنے کی کوشش کریں۔

انسان کا چہرہ اس کے وجود کی پہچان ہے۔اور چہرے میں سب سے زیادہ بلیغ نقش آنکھیں ہیں۔کہ یہ خاموش رہ کر بھی اکثر باتیں کرتی ہیں۔ہونٹ ہیں جو اعجاز مسیحائی دکھاتے ہیں۔رخسار ہیں کہ روشنی کا استعارہ ہیں اور زلف و گیسو کہ آسودگی کی علامت ہیں

اس چہرے میں زلف و رخسار کا دلکش منظر دیکھئے۔

کھلے بالوں کے ہالے میں وہ اس کا چاند سا چہرہ
اندھیرا خوبصورت ہے، اجالا خوبصورت ہے

اوراب لہجۂ گل کے حامل ہونٹوں پر تبسم کے فقدان اوران کے طرزِ تکلم میں تبدیلی کے تیور دیکھئے۔

پہلے بھی خوشی کوئی مکیں دل میں کہاں تھی
چھن جائے یہ ہونٹوں کا تبسم بھی تو کیا ہے؟

اور

تبدیل ہوا سارے زمانے کا رویہ
بدلے جو ترا طرزِ تکلم بھی تو کیا ہے؟

اوراب آنکھیں۔

اس کے چہرے اس کی آنکھوں میں کھویا تھا
میں تو شب بھر چاند ستاروں میں کھویا تھا

اور

اس کی آنکھیں گہرا سمندر دیکھ رہی تھیں
گہرا سمندر اس کی آنکھوں میں کھویا تھا

اوراگر کبھی شیشۂ خواب ٹوٹ جائے تو اس کی کرچیاں انہی آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

کرچیاں آنکھوں میں چبھ جائیں گی
ٹوٹ جائے گا اگر شیشۂ خواب

ان آنکھوں میں ضبطِ گریہ کا یہ عالم ہے

کوئی آنسو سرِ مژگاں نہیں آنے پاتا
پسِ مژگاں تو وہ سیلاب نظر آتا ہے

اوراگر یہ آنکھیں لہو رونے پہ آئیں تو سمندر سے زیادہ بیکراں ٹھہریں

لہو روتی ہوئی آنکھوں کے ہر قطرے میں گویا
سمندر سے زیادہ بیکرانی آ گئی ہے

ان آنکھوں کی پیاس جب حد سے بڑھتی ہے تو اسے کوئی چشمۂ خواب ہی سیراب کر سکتا ہے۔

انکھ کی پیاس بڑھی جاتی ہے
پھر کوئی عکس کوئی چشمہ خواب

اور آخر ایک دن ہم پر یہ حیران کن حقیقت بھی کھلتی ہے کہ زندگی اصل میں ایک لمحۂ خواب کے سوا کچھ نہیں۔ کہ ادھر آنکھ کھلی اور سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور یہی انجام حیات ہے۔

آنکھ کھل جائے نجانے کس دم
زندگی کیا ہے؟ بس اک لمحۂ خواب

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسیم سحر کی غزل جہاں فکر وفن کے نئے تناظر میں تازگی اور ندرت کی حامل ہے۔ وہاں جذبے کی بے ساختگی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت اور حدت بھی اس میں موجود ہے۔ اور یہ ساری صفات مل کر انہیں جدید اردو غزل کے ایک ایسے اہم شاعر کا پیکر عطا کرتی ہیں۔ جس نے بلاشبہ اردو غزل کو فکر وفن کے نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ یہ نئے پہلوان کے خیال اور ان کے خواب ہیں۔ جو واقعی سب الگ ہیں اور یہی انفرادیت انہیں اپنے معاصرین میں ایک نمایاں امتیاز عطا کرتی ہے۔

متاعِ دردِ دل کا حامل .....یوسف مرزا رہبر

نعت گوئی ایک مبارک فن ہے ۔کہ اس کا رشتہ کائنات کی اس عظیم ترین ہستی سے ہے جو بعد از خدا بزرگ و برتر ہے ۔جو وجہِ تخلیق دو عالم ہے ۔جو محبوبِ خداوند قدوس ہے ۔اپنے محبوب کی مدح وستائش سب سے پہلے ذاتِ باری نے خود فرمائی ۔اور دیگر کتب آسمانی کے علاوہ قرآن مجید اس سلسلے میں ایک واضح ثبوت ہے ۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نعت گوئی یعنی ثنائے محبوبِ خدا سنتِ الٰہی ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی ۔یہ سنت ادا کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ۔جب تک کہ خدائے لم یزل کی توفیق شامل حال نہ ہو۔

اس سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تاریخ اسلام میں نعت کا آغاز عہدِ رسالت ہی میں ہوگیا تھا ۔اس سلسلے میں معروف صحابی رسولؐ حضرت حسانؓ بن ثابت کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔عربی سے نعت فارسی میں آئی اور پھر اردو اور دیگر زبانوں میں اس کا رواج ہوا ۔اور آج یہ صورت ہے کہ معنوی اور فنی لحاظ سے نعت ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ہماری زبان اردو میں یہ اسقدر مقبول و مروج ہے کہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شاعر ہو جس نے ایک آدھ نعت نہ کہی ہو ۔اور بعض شعرا تو اس سلسلے میں مثال کا درجہ رکھتے ہیں ۔انہوں نے نعت گوئی میں اس قدر خصوصیت حاصل کی کہ یہ ان کی پہچان بن گئی اور اس حوالے سے تاریخ ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ۔مثلاً محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ، بیدم وارثی، ظفر علی خاں اور ماہر القادری اور دورِ حاضر میں عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، مظفر وارثی اور عاصی کرنالی ۔

نعت میں جن جذبات عقیدت و مودت کا بیان ہوتا ہے ان کا تعلق چونکہ کائنات کے عظیم ترین انسان سے ہے ۔اس لئے یہ جذبات بھی عام جذبات محبت نہیں ۔فکر کی پاکیزگی اور خیال کی بلندی کے علاوہ زبان و بیان کی شائستگی کے ساتھ ساتھ ایک وارفتگی بھی ان کے اظہار کے لئے ضروری ہے ۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کہنے والے کی شخصیت میں اخلاص کا ہونا بیحد ضروری ہے ۔کہ اس کے بغیر نعت نہیں کہی جا سکتی ۔نعت کے موضوعات میں شمائل و فضائل نبویؐ کے علاوہ تعلیمات نبویؐ اور معمولات و اخلاقِ نبویؐ کے ان گنت پہلو شامل ہیں ۔چنانچہ ایسی جامع صنف میں شعر کہنا عام اصناف کے مقابلے میں آسان نہیں ۔کہ اس میں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت ہے ۔بقولِ میر

ع لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

ذرا سی بے احتیاطی سے سوئے ادب کا پہلو نکل سکتا ہے ۔اس لئے نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے ۔اور یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرا اس میدان میں سلامت روی اختیار کر سکے ہیں ۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بغیر توفیق الٰہی کے نعت گوئی ممکن نہیں ۔وہ لوگ خوش بخت و خوش نصیب ہیں جنہیں ذات خداوندی کی بارگاہ سے یہ توفیق حاصل ہوئی ہو ۔ہمارے محترم مرزا محمد یوسف رہبر بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں ۔جنہیں مدحِ سرکارِ دو عالم کی سعادت حاصل ہوئی ہے ۔مرزا صاحب ایک کثیر التصانیف اہل قلم ہیں ۔نظم و نثر میں اس سے پہلے ان کی نو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور یہ دسواں مجموعہ ہے جو صرف نعت پر مشتمل ہے ۔

عشق کے لئے معرفت پہلی منزل ہے اور معرفت بغیر علم کے حاصل نہیں ہوتی ۔عشق نبی بھی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں شعور کی روشنی شامل نہ ہو اور یہ روشنی عاشقِ صادق کو بارگاہ حضورؐ ہی میں میسر آ سکتی ہے ۔کہ حضورؐ تمام تر علم و شعور آگہی کا سرچشمہ ہیں ۔

عشق دام شعور میں آیا
بارگاہ حضورؐ میں آیا

بصیرت اور بصارت کا تعلق روح اور جسم کا تعلق ہے، بصیرت دل کی روشنی ہے جبکہ بصارت نظر کی روشنی بغیر بصیرت کے بصارت بیکار ہے کہ اشیاء کی تہہ تک پہنچنے کے لئے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی درکار ہے۔ اور اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ بصارت کے لئے اگر سرمہ بنائی جا سکتی ہے تو خاکِ مدینہ، پھر اس سرمے سے منور آنکھ کو جلوۂ دنیا متاثر نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ نے اسی لئے کہا تھا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مرزا صاحب بھی اسی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بصیرت نے کہا خاکِ مدینہ
بصارت کے لئے سرمہ بناؤں

اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے اہل دانش کو اس امی لقب کا دیا ہوا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔

بھٹکتے پھر رہے ہیں اہلِ دانش
میں امی کا سبق ان کو پڑھاؤں

درود پاک ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کا اجر اللہ کی بارگاہ سے رحمتوں کی شکل میں دس گنا ہو کر ملتا ہے۔ اور یہ درود پاک ہی کا اعجاز ہے کہ اس کی بدولت کبھی شاہِ بطحاؐ کی دلپذیر صورت کا دیدار ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

مرے لب پر درود پاک کے جب پھول کھلتے ہیں
نظر کے سامنے ہوتی ہے صورت شاہِ بطحاؐ کی

نعت کہنے کے لئے کئی شرائط ہیں۔ بقولِ شاعر

عقیدت سوز سے معمور ہو تو نعت ہو جائے
دل بے نور رشکِ طور ہو تو نعت ہو جائے

کہاں ملتی ہے شاعر کو سعادت نعت گوئی کی
مرے محبوب کو منظور ہو تو نعت ہو جائے

گویا عقیدت میں سوز ہو اور دل میں عشق نبیؐ کی روشنی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محبوب خداوندِ قدوس کو منظور ہو تو نعت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک بارگاہِ رسولؐ سے منظوری نہ ہو نعت نہیں ہو سکتی۔

حضورؐ کا اسمِ گرامی اتنا میٹھا اور حلاوت آفریں ہے کہ اس نام کے فیض سے تلخیٔ دوراں کی شدت، حیات افروز شیرینی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بڑھی جاتی ہو معمولات میں جب تلخیٔ دوراں
تیرے اسم گرامی سے حلاوت گھول لیتا ہوں

اسی طرح ایک اور جگہ اسم محمدؐ کا اعجاز دیکھئے۔

زباں پہ خود بخود اسمِ محمدؐ ہو گیا جاری
اگر حالات میں ہم نے کبھی کچھ ابتری دیکھی

اقبالؒ نے کہا تھا

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

انسان کی عظمت و برتری کا ایک بڑا ثبوت انسان کامل کا عرشِ معلیٰ تک پہنچنا ہے اور شبِ معراج اس کی شاہد ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

شبِ معراج میں عرشِ معلیٰ نے قدم چومے
کہاں ارض و سما نے یوں بشر کی برتری دیکھی

یہ حضورؐ کا بے مثال حُسنِ اخلاق ہے جس نے خون کے پیاسے دشمنوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی کی فضا دوستی میں بدل گئی۔

ازل کے دشمنوں کو بھی بنایا اپنا گرویدہ
عداوت کی فضاؤں میں بھی اس نے دوستی دیکھی

فتحِ مکہ کے وقت بے پناہ کرم کا مظاہرہ فرماتے ہوئے رحمت اللعلمین کا جانی دشمنوں کو معاف کردینا تاریخ انسانی کا ایک عدیم النظیر واقعہ ہے۔

رہے جو جان کے دشمن انہیں جاں کی اماں بخشی
کرم کے دلربا پیکر محمدؐ یاد آتے ہیں

قرآن فہمی کے لئے سیرتِ رسولؐ کا مطالعہ بے حد ضروری ہے کہ قرآن ایک کتاب ہے تو آپ کی سیرت اس کتاب کی عملی تفسیر ہے۔

قرآں کا فہم سہل ہوا تیری ذات سے
سیرت میں اس کتاب کی تفسیر مل گئی

عاشقِ رسولؐ ہجر وفراق کی کیفیت میں ہر پل ہر گھڑی اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے اور اپنی عقیدت والفت کا والہانہ اظہار یوں کرتا ہے۔

خدا کا نام لینے پر محمدؐ یاد آتے ہیں
دھڑکتا ہے دل مضطر محمدؐ یاد آتے ہیں

نقوشِ پا نظر آتے ہیں جن کے کہکشاؤں میں
بہی کونین کے سرور محمدؐ یاد آتے ہیں

انہیں میں اپنے پیاروں سے زیادہ پیار کرتا ہوں
مجھے ماں باپ سے بڑھ کر محمدؐ یاد آتے ہیں

یہاں بھی ان کے سائے میں وہاں بھی ان کے سائے میں
گنہگاروں کو رہ رہ کر محمدؐ یاد آتے ہیں

بقول اقبال

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

حقیقت یہ ہے کہ عشقِ رسولؐ ہی اصلِ دین ہے۔ چنانچہ ساقیٔ کوثر سے دلی محبت جنت میں جانے کا پروانہ قرار پاتی ہے۔

بھلا جنت نہ کیوں اس شخص کی قسمت میں ہو جس کو
جنوں ہو ساقیٔ کوثر سے کے ہاتھوں جام پینے کا

حضورؐ کی ذاتِ گرامی جس بے کس کا سہارا ہو جائے۔ اسے اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہئے اور پھر اس کی کشتی کو طوفانوں کا کوئی خوف وخطر محسوس نہیں ہونا چاہئے۔

تلاطم خیز دریا کا بھلا کیوں خوف ہو اس کو
وہ ختم الانبیاءؐ ہو ناخدا جس کے سفینے کا

حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر درود وسلام خود خالقِ ارض وسما بھی بھیجتا ہے اور اہل ایمان کو بھی اس عظیم عبادت کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ بارگاہِ حضورؐ میں سلام ایک ایسی سعادت ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ نعت گو شعرا نے اس طرف بھی توجہ دی ہے اور اس میدان میں کئی شہکار تخلیق کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو میں دو سلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے مطلع ہیں۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی

اور

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی

سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے ان مقبولِ عام سلاموں کے بعد سلام کہنا مشکل نظر آتا ہے۔
لیکن مرزا یوسف رہبر نے اس میدان میں بھی اپنے انداز میں قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔چند شعر دیکھئے۔

سلام اس پر جسے حاصل تصرف ہے زمانے پر
نگوں رہتے ہیں آج اور کل اسی کے آستانے پر

سلام اس پر جسے اپنوں نے بیگانوں نے جھٹلایا
مگر اس کی جبین ناز پر ہرگز نہ بل آیا

سلام اس پر جو علم و دانش و حکمت کا معدن تھا
علوم ظاہر و باطن کا وہ لاریب مخزن تھا

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مرزا صاحب کی نعت گوئی میں وہ سب کچھ ہے جو نعت کا اختصاص ہے۔یعنی ان کی فکر میں طہارت' خیال میں رفعت اور احساس میں خلوص ہے۔زبان و بیان میں اظہار کی سادگی کے ساتھ ساتھ کوثر و تسنیم کی سی حلاوت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عشقِ رسول کی سرمستی ہے جو ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی نظر آتی ہے۔متاعِ دردِ دل انسان کی اصل میراث ہے اور سوزِ جاں اس کا حقیقی سرمایہ۔یہ متاع یہ سرمایہ حضورؐ کی غلامی ہی کا ثمر ہے کہ عشقِ رسولؐ کے بغیر یہ دولت ہاتھ نہیں آتی۔

متاعِ دردِ دل ان کے غلاموں ہی کو ملتی ہے
عطا کرتی ہے سوزِ جاں عقیدت شاہِؐ بطحا کی

مرزا صاحب خوش نصیب ہیں کہ انہیں یہ متاعِ درد دل حاصل ہے۔یہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

آگہی کی تلاش کا شاعر قاضی یونس

یہ آج سے کوئی دس بارہ سال پرانی بات ہے۔میں سعودی عرب کے منطقۂ شرقیہ میں نیا نیا آیا تھا اور الخبر کے پاکستانی اسکول کی پیرنٹس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب میں بطور مہمان خصوصی شریک تھا۔محفل کے اختتام پر جہاں بہت سے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں ایک صاحب سفید شلوار قمیص پر ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ سیاہ جناح کیپ اور سیاہ واسکٹ پہنے نظر آئے۔معلوم ہوا کہ ایسوسی ایشن کے اہم عہدیدار ہونے کے ناطے وہ اس محفل کے سفید وسیہ کے بھی مالک ہیں۔تقریب کے اختتام پر وہ اس والہانہ انداز سے ملے جیسے برسوں پرانی شناسائی ہو۔میں ان کے خلوص اور وضعداری سے بے حد متاثر ہوا۔تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ منطقۂ شرقیہ کی ممتاز سماجی شخصیت محمد یونس قاضی ہیں۔خود بھی شعر کہتے ہیں اور اپنی خوش ذوقی' علم دوستی اور ادب نوازی کے باعث یہاں کی ادبی محفلوں کی بھی جان ہیں۔منطقۂ شرقیہ کا کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔موصوف کچھ اس اپنائیت اور بے تکلفی سے بغل گیر ہوئے کہ اجنبیت اور تکلف کی ساری دیواریں گر گئیں۔وہ دن اور آج کا دن' ان کے خلوص' محبت اور چاہت میں ذرا کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس دوستی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔اور اب یہ عالم ہے کہ میں انہیں اپنا بہترین دوست کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔اور حالی کے شعر میں ذرا سے تصرف کے ساتھ ان کے بارے میں بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہوں۔

بہت جی خوش ہوا قاضی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

قاضی صاحت کی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینے کی طرح آبدار ہے۔صاف' ستھری' بے

داغ آئنے کی طرح، سراپا خلوص ومحبت، سادگی، انکسار، رواداری، ایثار، سچائی درد جرأت اور جہد مسلسل کی صفات اس رخشندہ وتابناک نگینے میں پوری شان سے چمک دمک رہی ہیں۔اپنوں بیگانوں سب کے کام آنا ان کی عادت ہے۔انسانیت ان کا مسلک ہے اور درد دل کے ایسے پیکر کہ کسی کی ذرا سی بھی تکلیف پر بے اختیار تڑپ اٹھتے ہیں۔وہ لاہور کے رہنے والے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شگفتہ مزاج اور زندہ دل ہیں ان کے بات کرنے کا اپنا خاص انداز ہے، چونکانے کی حد تک اپنائیت اور بے تکلفی سے پر۔یاروں کے یار ایسے کہ ان کا ہر دوست یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جواب میں بھی انہیں ہر طرف سے بے پناہ محبت اور عزت ملتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ غریب وہ نہیں جس کی جیب خالی ہو۔بلکہ غریب اصل میں وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔اس لحاظ سے وہ دوستوں میں خود کو امیر ترین سمجھتے ہیں کہ ان کے بہی خواہوں کی تعداد کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ہر مسلک ومشرب کے لوگ ان میں شامل ہیں۔سیلانی ایسے کہ تقریباً ساری دنیا گھوم چکے ہیں۔مگر لطف یہ ہے کہ نگری نگری پھر کر بھی گھر کا رستہ نہیں بھولے۔اپنا وطن ہر آن ہر لمحہ انہیں یاد رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پردیس میں عمر کا زیادہ حصہ گزرنے کے باوجود وطن عزیز پاکستان آج بھی ان کی رگ رگ میں خون بن کر رواں دواں ہے۔اور اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک سچے اور دردمند پاکستانی ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

زیر نظر کتاب ''آگہی کی تلاش'' ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔جو ان کے احباب کے پرزور اصرار پر منظر عام پر آ رہا ہے۔ورنہ وہ اس کے شائع کرانے سے اب بھی گریزاں ہی تھے۔

اب کچھ ان کی شاعری کے بارے میں۔شاعری کو عام طور پر شاعر کی ذات ہی کا ایک عکس کہا جاتا ہے۔اگر یہ بات درست ہے تو قاضی صاحب کی شاعری گویا ان کی پوری شخصیت کا پرتو ہے۔اس میں بھی ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی خلوص ومحبت، سادگی وانکسار، رواداری، ایثار، سچائی، درد، جرأت اور جہد مسلسل کی صفات پوری طرح کارفرما ہیں۔

قاضی صاحب غزل کے شاعر ہیں۔اور آپ جانتے ہیں کہ غزل ہمارے یہاں اصناف سخن

میں دل کا احوال بیان کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔کہ شاعر کہیں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دیتا ہے اور کہیں سب کچھ کہہ دینے کے باوجود بھی کچھ نہیں کہہ پاتا کہ رمز وکنایہ اس کا خاص ہنر ہے۔قاضی صاحب کو بھی شاید یہ صنعتِ سخن اسی لئے مرغوب ہے کہ وہ کبھی تو اشاروں اشاروں میں ساری بات کہہ دیتے ہیں اور کبھی ساری بات کہنے کے باوجود اپنے بیان کو تشنہ رکھنا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تغزل کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

فطری طور پر وہ حسن کے دلدادہ ہیں اور اسے ایک نظر دیکھنے سے ہی خمار کی سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔

اک نظر دیکھتا ہوں جب تم کو
بن پئے ہی خمار آتا ہے

حسن کی معجزاتی تاثیر کے بھی وہ قائل ہیں۔

جس نے قدموں کو تیرے چھوا
خاک وہ کیمیا ہو گئی

اور

جس خذف نے ترے جسم کو چھو لیا
ہو گیا وہ گہر دیکھتے دیکھتے

عاشق صادق ایسے کہ محبوب کے نقشِ پا کے سوا کہیں اپنی پیشانی نہیں جھکاتے۔

ہم وہاں پر جبیں نہیں رکھتے
جو ترا نقشِ پا نہیں ہوتا

ان کے تغزل میں سادگی کے ساتھ ساتھ شوخی اور کہیں کہیں درد کی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔

آج تک یاد کے دریچوں سے
مسکراتی ہیں آپ کی آنکھیں

ہم کو جنت کا یاد ہے نقشہ
یہ بھی تیری گلی سے ملتا ہے

تیرے دامن کو چھو نہیں سکتے
اس لئے شرمسار ہیں آنسو

مہکتے ہیں ابھی تک لفظ خط کے
تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا

ہار کر بھی وہ مجھ سے جیت گیا
اس کا انداز فاتحانہ تھا

سر برہنہ کہاں ہیں ہم قاضی
درد کے سائباں میں رہتے ہیں

زخم ناسور نہ بن جائے پرانا ہو کر
جو بھی کانٹا ہے چبھا دل میں نکالا جائے

جس دن سے ہو رہی ہے صورتگری تمہاری
کعبہ ہمارے دل کا بت خانہ بن گیا ہے

ان کے اکثر مطلعوں میں ایسی کمال کی بیساختگی اور برجستگی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔مثلاً چند مطلعے دیکھئے۔

ان سے اپنا کہا نہیں ہوتا
ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا

تری آواز کا دھوکہ ہوا تھا
مسافر راہ میں ٹھہرا ہوا تھا

رو برو اس کے جب سنورتا ہے
آئنے کا بھی دل دھڑکتا ہے

میکدے میں نہ وہ خمار میں ہے
جو نشہ ذکر حسن یار میں

چلنے لگی پروائی تو دل ڈوبنے لگا
جب اس کی یاد آئی تو دل ڈوبنے لگا

اب تک آپ نے ان کے اشعار میں دل کے اندر کے جہاں کی نیرنگیاں دیکھیں۔اب ذرا باہر کی دنیا پر بھی نظر ڈالیں۔ان کی حقیقت پسند طبیعت کچھ یوں اظہار حقیقت کرتی دکھائی دیتی ہے۔

مسائل پھولتے پھلتے نہیں ہیں
کوئی جب درمیاں ہوتا نہیں ہے

کس قدر پر اثر جھوٹ کی آگ تھی

سچ ہوا بے اثر دیکھتے دیکھتے
منظر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں ہم
پردے اٹھائے ہیں کبھی پردے گرائے ہیں

پرسان حال آپ کا ہوگا نہ پھر کوئی
ہم جیسے دوستوں سے کنارا تو کیجئے

حادثے خود بخود ملاتے ہیں
کون ورنہ کسی سے ملتا ہے؟

بالیقیں ہے کوئی مفاد اس کو
جو تجھے عاجزی سے ملتا ہے

سبھی راز افشا کئے ہیں اسی نے
جیسے وہ بہت معتبر جانتے ہیں

گھر تو دیکھا تھا سب نے جلتے ہوئے
آگ کس نے مگر بجھائی ہے

مٹ گیا سب اختلاف باہمی
بس انا زیر قدم کرنی پڑی

ان حقائق کے بیان کے پہلو بہ پہلو وہ معاشرے پر بڑی جرأت اور بے خوفی سے تنقید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

تم پہ کھل جائے گا آج اپنا بھرم
گھر میں جا کر ذرا آئنہ دیکھنا

اے وقت کے سلطان تجھے اس کی خبر ہے؟
کچھ شہر ترے عہد میں مسمار ہوئے ہیں

یہ کیسا شخص میر کارواں ہے؟
نہیں جو جانتا منزل کہاں ہے؟

خار تھے سرخ پی کے خون چمن
بس انہی کو گلاب لکھا گیا

خون بہا کس سے مانگئے قاضی
بھائی قاتل بنا ہے بھائی کا

بیٹھ کر کرسی عدالت پر
کتنا مشکل ہے فیصلہ کرنا

اس کے علاوہ نفسیاتی طور پر وہ تضاد کی کیفیت کا بھی شکار ہیں۔ مثلاً

میرا مسکن ہے برف زاروں میں

آتش غم مجھے جلاتی ہے

گھر سے باہر جشن بپا تھا
گھر کے اندر سناٹا تھا

اک دنیا ہمراہ مرے
پھر بھی کتنا تنہا ہوں

تجھ سے میرا رشتہ کیا؟
تو دریا میں صحرا ہوں

اس ساری صورتحال سے وہ مایوس ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ امید و آس کا دامن تھامے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر

کیوں خزاؤں سے خوف کھاتے ہو؟
آ رہی ہے بہار بھی دیکھو!

آس رہتی ہے صبح روشن کی
حوصلہ تیرگی سے ملتا ہے

اور یہ ہمت اور حوصلہ انہیں ہر طرح کے سنگین حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھتے ہیں۔

خود چلا آؤں گا تختۂ دار پر
میرے قاتل! مرا حوصلہ دیکھنا

خون روتی ہے تیغ قاتل بھی
جیت پوشیدہ میری ہار میں ہے

کوئی آئے گا نہ ہر گز تھامنے
گرنے والوں کو سنبھلنا چاہئے

زخم اپنے پرائے لوگوں کو
مجھ کو عادت نہیں دکھانے کی

ظلم خود تھک کے چور ہو جائے
صبر کی ایسی انتہا کرنا

زندگی قاضی ہماری ہے فقط
اک مسلسل جستجو کا سلسلہ

یہ اسی مسلسل جستجو کا سلسلہ ہے کہ شاعر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

آگہی کی تلاش رہتی ہے
مجھ کو اپنی تلاش رہتی ہے۔

اور دیکھا جائے تو زندگی کا یہ سارا سفر ذات کی آگہی کی تلاش کا سفر ہی تو ہے۔قاضی کی شاعری فنی لحاظ سے سادگی اور سچائی سے عبارت ہے اور اس میں بناوٹ اور تکلف نام کی کوئی شے نہیں۔کیونکہ قاضی کی اپنی ذات بھی تو سادگی اور سچائی ہی سے عبارت ہے۔